cat

سلسلۂ مطبوعات: ۱۱۹

جوش ملیح آبادی

(انسان اور شاعر)

مصنفہ

سید احتشام حسین

اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

جوش ملیح آبادی ۔ انسان اور شاعر

سید احتشام حسین

پہلا ایڈیشن ۱۹۸۳ء

تعداد ۲۰۰۰

قیمت ۵/۰ روپے

ستیش چندر رستوگی سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی نے نشاط پریس ٹانڈہ سے چھپوا کر لہرہ ہاؤس، قیصر باغ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱ سے شائع کیا۔

پیش لفظ

جو لوگ پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم سے قریب رہے ہیں یا جنھوں نے ان کی تحریروں کا عمیق مطالعہ کیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مرحوم نے پانچویں دہائی میں ہی جوشؔ ملیح آبادی کی شخصیت اور ان کے فکر و فن پر ایک مبسوط مگر جامع کتاب کی تصنیف کا طویل المیعاد منصوبہ مرتب کیا تھا۔ یہی نہیں، مجوزہ کتاب زیرِ تسوید تھی اور مرحوم نے اس کے بعض اجزا اشاعت کے لیے بھی دے دیے تھے۔ انھوں نے کتاب کے ابواب قائم کر لیے تھے اور ہر باب کا خاکہ مرتب کر لیا تھا۔ ہر باب کے ذیل میں وہ اپنے خیالات قلم بند کرتے جاتے تھے۔ اس نامکمل کتاب کا مسودہ اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ مرحوم نے مواد فراہم کر لیا تھا، کتاب کو آخری شکل دینے کے لیے صرف فرصت اور یکسوئی کی ضرورت تھی جو انھیں نصیب نہ ہو سکی۔ پھر بھی جوشؔ کیا تھے، ان کے محرکات و عوامل کیا تھے، ان کا فن ارتقا کی کن منزلوں سے گزرا، ان سوالوں کا جواب احتشام صاحب کی نامکمل تحریروں میں مل جاتا ہے۔ ہر چند ان تحریروں میں وہ ربط نہیں ہے جو ایک مکمل کتاب کے ابواب میں ہوتا ہے لیکن مجموعی تاثر کے لحاظ سے اسے مکمل کتاب کا درجہ حاصل ہے ــــــ اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ ایک عظیم شخصیت کے سیاق و سباق میں دوسری عظیم شخصیت کے رشحاتِ قلم ہیں جن سے ہمیشہ کسبِ نور کیا جاتا رہے گا۔

احتشام صاحب کو اس کا حق حاصل تھا کہ وہ جوشؔ پر بھرپور کتاب لکھتے۔ وہ جوشؔ سے اس وقت قریب ہوئے جب ان کا تنقیدی شعور پختگی کی تلاش میں تھا

اور معاصرین میں ان کی حیثیت نمایاں ہونے لگی تھی۔ جوش کی شخصیت اور شاعری دونوں نے انھیں متاثر کیا اور خود جوش کا یہ حال تھا کہ تفاوت عمر کے باوصف وہ احتشام صاحب کا احترام کرتے تھے۔ جوش کب کسی کو خاطر میں لانے والے تھے لیکن احتشام صاحب کی صلاحیت اور ان کی شخصیت نے جوش کو قابو میں کر لیا تھا۔ دونوں کے تعلقات میں امتدادِ عمر کے ساتھ استواری آتی گئی۔ شخصیت اور فن کی شناخت میں جو عناصر معاون ثابت ہوتے ہیں، احتشام صاحب نے انھیں فراہم کر لیا تھا اور وہ سچ مچ جوش پر ایک مستند ماخذ بن گئے تھے۔

تنقید کی دنیا میں اس طرح کے تعلقات کی استواری کبھی کبھی بڑی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ نقاد جسے موضوع قلم بناتا ہے، تعلقات کی استواری اسے ہیرو یا ممدوح کے منصب پر فائز کر دیتی ہے۔ احتشام صاحب شریف النفس اور رقیق القلب تھے۔ جوش کی شخصیت بڑی پیچیدہ اور متضاد تھی اس کا تجزیہ آسان نہیں لیکن احتشام صاحب کی تنقید میں تعلقات کی استواری سدِ راہ نہیں بنی۔ جوش سے ان کے ذاتی تعلقات کی سطح جو بھی رہی ہو۔ جوش کی شخصیت پر جب بھی انھوں نے قلم اٹھایا تو ایک بالغ نظر نقاد کی حیثیت سے اٹھایا اس طرح "جوش ملیح آبادی انسان اور شاعر" صرف جوش کے افہام و تفہیم میں معاون نہیں ہوگی بلکہ احتشام صاحب کی بے لاگ تنقیدی بصیرت کا نمونہ بن کر زندہ رہے گی۔

اکادمی احتشام صاحب کے وارثوں کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت کا موقع اسے فراہم کیا۔ امید ہے کہ اکادمی کی دوسری مطبوعات کی طرح اسے بھی حسن قبول حاصل ہوگا۔

محمود الٰہی
چیرمین
مجلس انتظامیہ

اتر پردیش اردو اکادمی
قیصر باغ، لکھنؤ
۱۲ اگست ۱۹۸۳ء

فہرستِ مضامین

اپنے عزیز طلبا کے نام

دیباچہ

آپ جوش ملیح آبادی کی شاعرانہ عظمت اور فکری اہلیت کے قائل ہوں یا نہ ہوں لیکن اس سے تو آپ بھی انکار نہ کر سکیں گے کہ آج کی اردو شاعری کا خیال آتے ہی جوش کا نام سب سے پہلے ذہن میں ابھر آتا ہے اور کئی حیثیتوں سے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان کی عمر ساٹھ سال کی ہو چکی، ان کی شاعری کی عمر چالیس سال سے زیادہ ہے۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام کو شائع ہوئے چھتیس ۳۶ سال گزر چکے لیکن ابھی تک کسی نے ان کی شاعری پر پوری توجہ نہیں کی اس بے اعتنائی کے اسباب کی چھان بین کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہندوستان اور پاکستان میں صالح اور مخلصانہ ناقدانہ بصیرت کا اتنا فقدان ہے جس سے ایسی امید وابستہ کرنا عبث ہے۔ کتاب تو چیز بڑی چیز ہے اب تک جوش پر کوئی ایسا مضمون یا ناقدانہ تبصرہ بھی شائع نہیں ہوا ہے جس سے ان کی شاعری اور شخصیت کا واضح نقشہ نظروں کے سامنے آ سکے یا ان کے خیالات کی بنیادوں پر روشنی پڑ سکے اس لیے میں نے اس موضوع پر قلم اٹھانے کی جرأت کی ہے۔ "جرأت" کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ ایک زندہ شاعر، جس کے دوست اور دشمن، بہی خواہ اور بدخواہ، پرستار اور منکر سبھی موجود ہوں، نقاد کو بڑی دشواریوں میں مبتلا کرتا ہے۔ اس پر اچھی طرح نگاہ جمنے نہیں پاتی۔ اس کی شخصیت کے بعض پہلو اتنے نمایاں ہو جاتے ہیں کہ دوسرے پہلوؤں کے نظر انداز ہو جانے

کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے، شاعر سے واقفیت رکھنے والے اپنے علم و آگہی کی تصویر نقاد کی تحریروں میں ڈھونڈھنے لگتے ہیں، حاسد اور بدبیں ہر قدم پر مصلحتوں کی جستجو کرتے اور نیت کا پتہ لگانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اگر لکھنے والے میں اخلاقی جرائت اور ادبی دیانت داری نہ ہو تو یہ خیالات اس کے قلم میں زنجیریں ڈال سکتے ہیں۔

مجھے بھی بہت سی دشواریوں کا اندازہ ہے۔ جوش ملیح آبادی سے میرے تعلقات ہیں ان کے سدِ راہ ہونے کا خیال بھی مجھے آتا ہے انھوں نے ہندوستان سے پاکستان جاتے وقت جس عذرِ گناہ بدتر از گناہ قسم کے خیالات کے مظاہرے کیے اور اُن کا جو اثر ہندوستان اور پاکستان کے عوام اور خواص کے ذہنوں پر مرتب ہوا اُس سے ذہنی الجھن پیدا ہونے کا فطری اندیشہ ہے، اُن کے ترکِ وطن کو میں ایک بہت بڑی غلطی سمجھتا ہوں اور اُن کے اس اقدام پر رنجیدہ بھی ہوں لیکن میں نے طے کیا ہے کہ کوئی چیز میری راہ میں حائل نہ ہوگی اور میں ان کی شاعری اور شخصیت پر رائے دینے میں اس غیر جذباتی اندازِ نظر سے کام لوں گا جس پر مجھے اعتماد ہے۔ بعض اہم نقادوں کا خیال ہے کہ کسی شاعر کا مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ نقاد اس کی زندگی کے تمام اہم واقعات سے اچھی طرح واقف نہ ہو کیوں کہ شاعر کی روح اور شخصیت ہی کا عکس ہے جو شاعری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اس لیے جوش سے میری واقفیت اُن کی شاعری اور ان کے اندازِ فکر کی ہتیں کھولنے میں معین ہو سکتی ہے، اگر میرے سامنے کوئی ادبی نظریہ یا اصولِ تنقید نہ ہوتا تو البتہ یہ اندیشہ پیدا ہو سکتا تھا کہ میں شاعر کی زندگی اور اس کی شاعری میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش میں میکانکی طریق کار اختیار کر لوں گا لیکن سماجی حقیقت پسندی کے ہمہ گیر اور ہمہ جہتی طرزِ تنقید پر عمل پیرا ہونے کے بعد زندگی یا شاعری کے کسی اہم پہلو کے نظرانداز ہو جانے یا غلط طریقہ پر ایک دوسرے سے مطابق کر دیے جانے کی غلطی

کا امکان مجھے کم نظر آتا ہے، اس لیے شروع ہی میں یہ بات ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ یہ جوش یا جوش کی شاعری کا جذباتی مطالعہ نہیں ہے بلکہ تنقیدی مطالعہ ہے جس میں مواد اور ہیئت کے ہر اہم پہلو سے بحث کی جائے گی جن میں خارجی اور داخلی اثرات اور کیفیات کا تجزیہ کیا جائے گا جس میں جوش کی زندہ اور متحرک شخصیت کو ایک زندہ اور متحرک سماج کے نشیب و فراز میں دیکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

جوش پر ایک مختصر سی کتاب لکھنے کا خیال میرے دل میں پہلے پہل سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء میں پیدا ہوا جب میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو پڑھانے کے لیے مقرر ہوا۔ ایم اے کے نصاب میں جوش کا ایک مجموعۂ فکر و نشاط بھی شامل تھا۔ ہمارے طلبا ہر سوال کا بندھا ٹکا جواب چاہتے ہیں۔ ہر مصنف پر "نوٹ" کے خواہاں ہوتے ہیں۔ میں طلبا کو "نوٹ" لکھوانا غیر مفید ہی نہیں نقصان دہ بھی سمجھتا ہوں لیکن دشواری یہ بھی کہ جوش پر نہ تو کوئی کتاب تھی اور نہ کوئی معقول مضمون جس کا حوالہ دیا جا سکے اس لیے کچھ نہ کچھ لکھانا پڑتا تھا۔ اسی خیال سے کاغذ پر چند ضروری اشارے لکھ لیے۔ ان اشاروں کی مدد سے انھیں کچھ لکھوا بھی دیا لیکن مجھے یہ بات کچھ اچھی معلوم نہیں ہوئی اور میں نے سوچا کہ ایک مختصر سی کتاب لکھ کر اس تشنگی کو دور کروں یہ تھی ابتدائی تحریک۔

جوش اسی زمانے میں دہلی سے اپنا ادبی رسالہ کلیم لے کر ملیح آباد چلے آئے تھے، رسالہ بھی بند ہو چکا تھا کبھی کبھی لکھنؤ آتے تھے، رسالہ بھی بند ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی لکھنؤ آتے تھے اور دیر تک ملاقاتیں رہتی تھیں، میں نے یہ خیال اُن پر بھی ظاہر کر دیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اُن کی زندگی کے حالات معلوم کروں اور نقاد کے ساتھ ساتھ سوانح نگاری کا فرض بھی انجام دوں۔ جوش نے کہا "اگر لکھنا ہی ہے تو مجھ پر ایریل[٥] کی سی کتاب لکھیے۔" میں نے کہا "لکھ تو دوں لیکن کیا آپ اپنی زندگی کے

---

[٥] ایریل مصنفہ اندرے موروئے، یہ ایک فرانسیسی سوانح نگار کی لکھی (باقی اگلے صفحہ پر)

وہ سارے دفینے میرے سامنے کھول کر رکھ دیں گے جن سے آپ نے اپنی زندگی رنگین بنائی ہے؟" ٹھنڈی سانس بھر کر بولے "ٹھیک کہتے ہیں آپ، ہندوستان اور انگلستان میں بڑا فرق ہے۔ یہاں تو لڑائیاں چھڑ جائیں گی۔ اچھا! میں مرنے سے پہلے آپ کو کچھ تصویریں اور خطوط دوں گا اور اپنے اٹھارہ (۱۸) عشقوں کے حالات بتا دوں گا میرے مرنے کے بعد ایسی ہی سوانح عمری لکھ دیجئے گا۔" بات گئی گزری ہو گئی

وقت گذرتا گیا اور کتاب لکھنے کا خیال ارادے کی منزل سے آگے نہ بڑھا سنہ ۱۹۴۰ء میں جوش نے اپنی طویل نظم "حرفِ آخر" شروع کر دی اور جس رفتار سے شروع کی تھی اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ دو ڈھائی سال میں مکمل ہو جائے گی۔ میں نے سوچا یہ نظم ختم ہو جائے تو لکھوں کیوں کہ جوش اُن دنوں لکھنؤ ہی میں آکر رہنے لگے تھے اور جتنا حصہ بھی اُس نظم کا لکھ لیتے مجھے سننے کا موقع مل جاتا تھا کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر اس نظم کو پیشِ نظر نہ رکھا گیا تو جوش کا مطالعہ کسی حد تک غیر مکمل سا رہے گا گو اس میں کوئی ایسی نئی بات نہ تھی جس کا ادھورا نقش جوش کی سنہ ۱۹۴۰ء تک کی شاعری میں نہ ملتا ہو لیکن یہ کئی ہزار اشعار کی نظم اُن کے مرتب اور منظم خیالات کا آئینہ تھی اور ان کے مطالعہ کو کسی قدر آسان بناتی تھی لیکن تین چار سال گزر گئے اور نظم مکمل نہ ہوئی پھر جوش شالیمار پکچرز پونا چلے گئے اور "حرفِ آخر" کی رفتار اور سست ہو گئی۔

اسی درمیان میں ایک ایم۔ اے کے طالب علم کو ایک مقالہ اپنی نگرانی میں لکھوانا پڑا، عنوان تھا "جوش بہ حیثیت مفکر" اس وقت پھر پرانا

(حاشیہ سلسلہ صفحہ گزشتہ)

سے انگریزی کے مشہور جواں مرگ شیلی کی سوانح عمری ہے۔ انھیں دنوں نئی نئی چھپ کر انگریزی میں یہاں آئی تھی اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

خیال تازہ ہوا لیکن میری کاہلی کی نذر ہو گیا۔ جن طلبار کو معلوم تھا کہ میں جوش پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں وہ تقاضے کرتے رہے۔ جن دوستوں کو خبر تھی وہ اکساتے رہے، جن ناشروں کو پتہ چلا وہ اپنی خدمتیں پیش کرتے رہے لیکن بہت سے نیک ارادوں کی طرح یہ ارادہ بھی ارادہ ہی رہا۔ ۱۹۴۷ء میں ایک اشارہ پا کر میں نے کتاب شروع کر دی اور خیال تھا کہ چند مہینوں میں مکمل کرلوں گا لیکن جلد ہی حالات نے بے دلی اور بے عملی کی گود میں ڈال دیا۔ اور دوستوں کے اصرار کے باوجود میں نے کاغذات سمیٹ کر ایک طرف ڈالے تو اب دس برس بعد انھیں پھر مکمل کرنے کی نیت سے اٹھایا ہے، اور خیالات کے ٹوٹے ہوئے تار جوڑے ہیں۔ اس وقت تک جوش کے متعلق جہاں کہیں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ میں نے تقریباً سب پڑھا ہے بہت سے مباحثوں میں حصہ لیا ہے، اکثر احباب سے تبادلۂ خیال کیا ہے، خود جوش سے بحثیں کی ہیں، انھوں نے نظم و نثر میں جو کچھ لکھا ہے سب کا بغور مطالعہ کیا ہے اس لیے جو کچھ لکھا ہے غور و فکر کے بعد لکھا ہے۔ کتاب کی ترتیب وغیرہ کے متعلق چند جملے لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس کتاب میں سوانح حیات کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو حالات ہیں ان میں نہ تو اس سے زیادہ لکھنا ممکن تھا اور نہ وہ جوش کی شاعری کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے، لیکن ذہنی ارتقار پر ایک باب لکھ کر میں نے یہ کوشش ضرور کی ہے کہ ان کی شخصیت کے بظاہر متضاد پہلوؤں میں سے وہ حصے ڈھونڈھ نکالوں جو ان کی زندگی اور شاعری کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ گویا اس کتاب کے دو حصے ہیں، ایک میں ان کے ذہنی ارتقار اور شخصیت کا تذکرہ ہے جو ان کی شاعری کے مطالعہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں ان کے افکار و تصورات پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ابواب کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ جوش کی شاعری کا کوئی اہم پہلو چھوٹنے نہ پائے

دوسرے شعراء سے مقابلہ کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ حتی الامکان اس سے گریز کیا گیا ہے، کیونکہ اوّل تو کوئی مقابلہ مکمل نہیں ہوتا دوسرے اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ "حرفِ آخر" پر ایک الگ باب لکھ کر ضمیمہ کے طور پر اس لیے شامل کر لیا گیا ہے کہ ابھی وہ کتاب نہ تو مکمل ہے اور نہ جتنی ہے وہ سب کی سب شائع ہوئی ہے۔

جوش کا پہلا مجموعہ "روحِ ادب" سنہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا دوسرا مجموعہ "نقش و نگار" سنہ ۱۹۳۶ء میں نکلا، درمیان میں بعض مخصوص قسم کے مجموعے اور نظمیں الگ الگ بھی شائع ہوئیں لیکن سولہ سال کے وقفے میں جو ذخیرہ جمع ہو گیا تھا وہ ایک مجموعے میں کیسے سماتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر کئی مجموعے نکل گئے، ان مجموعوں میں نظمیں نہ تو تاریخی ترتیب سے جمع کی گئی ہیں اور نہ خود مجموعوں کی ترتیب تاریخی ہے مگر بہت سی نظموں میں تاریخِ تحریر دے دی گئی ہے اس سے بڑی مدد مل جاتی ہے۔ جوش کی شاعری کا مطالعہ تاریخی طور پر ہی سب سے زیادہ قابلِ اعتبار ہے اور میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے، گو بہت سی نظموں کی تاریخ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے نتیجوں میں غلطی کا امکان بھی ہے۔

جوش کا مطالعہ ہندوستانی ادب کے ایک بہت ہی اہم دور کا مطالعہ بھی ہے بدلتی ہوئی نسلوں کا مطالعہ ہے، تغیر پذیر دنیا کا مطالعہ ہے اس لیے بعض مباحث کو اس طرح پیش کرنا پڑا ہے کہ وہ بہ ظاہر موضوع سے الگ معلوم ہوتے ہیں لیکن میرے خیال میں ان کا اسی طرح پیش کیا جانا ضروری تھا ورنہ جوش کی شاعری کے لیے ضروری اور مناسب پس منظر مہیا نہ ہو سکتا۔

ابتدائے شاعری میں جوش کے لیے لوگوں نے "مصوّرِ جذبات" کا لقب استعمال کیا، کسی نے "شاعرِ فطرت" کہا، بعد میں "شاعرِ شباب" کے نام سے موسوم ہوئے پھر "شاعرِ انقلاب"، اور "شاعرِ اعظم" کے لقب دیے

گئے۔ یہ القاب مناسب ہوں یا نہ ہوں ان سے جوش کی شاعری کے اتار چڑھاؤ کے اور خود جدید اردو شاعری کے مزاج کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ میں نے ان باتوں کو پیش نظر رکھنے کی کوشش کی ہے تاکہ اردو شاعری کے تدریجی ارتقا میں جوش کی جگہ متعین کرنے میں آسانی ہو۔

اس کتاب میں ان اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش نہیں کی گئی ہے جو وقتاً فوقتاً جوش کی ذات یا شاعری پر کیے گئے ہیں لیکن ان کی شاعری کے متعلق متوازن نقطۂ نظر قائم کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ چند بنیادی مباحث پر قلم اٹھایا جائے۔ اتفاق ہے کہ کبھی کبھی وہی باتیں اعتراض اور نکتہ چینی کے طور پر بھی پیش کی گئی ہیں اس لیے ضمناً ان کا تذکرہ آگیا ہے۔ جوش ترقی پسند ہیں یا نہیں، مزاج کے حامی ہیں یا کوئی نظام حیات چاہتے ہیں، اشتراکی ہیں یا نہیں، شکک ہیں یا منکر، اُن کے خیال اور عمل میں ہم آہنگی ہے یا نہیں، اُن کی شاعری محض وقتی نعرہ بازی ہے، بحرانی چیخ پکار ہے یا فکر کے پروں پر اڑتی ہے، وہ محض تصور پرست ہیں یا حقیقت پسند، ان کے پاس کوئی پیام ہے یا نہیں —— یہ ایسی باتیں ہیں کہ اگر اعتراض کی شکل میں سامنے نہ آئی ہوتیں تو بھی ایک استدلالی اور مفصل مطالعہ میں ان کا زیر بحث آنا ضروری تھا۔ خاص طور سے اعتراض کے الفاظ کو پیش نظر رکھ کر ان کی حمایت یا مخالفت نہیں کی گئی ہے بلکہ شاعری کے تجزیہ سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں ان کو اپنے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ نتائج نکالنے میں جوش کے زبانی اقوال سے زیادہ ان کے تحریری خیالات سے مدد لی گئی ہے۔

جوش سے محبت کرنے والے بھی موجود ہیں اور نفرت کرنے والے بھی، ایسے بھی ہیں جو انھیں اردو کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں اور ایسے بھی جو معمولی ناظم سمجھتے ہیں۔ ایسے تمام لوگوں کی رائیں بہت احتیاط سے تسلیم کیے

جانے کے قابل ہیں۔ میں نے ان رایوں کو جوشؔ کی مکمل شخصیت اور شاعری کی روشنی میں پرکھا ہے اور کسی مخصوص نظم یا قول کی بنا پر یک طرفہ فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اس سے زیادہ ایک نقاد کے بس میں کچھ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی رایوں کو جانچے اور انھیں صرف اُس وقت تسلیم کرے جب وہ اس کے مطالعہ کے نتائج سے مطابقت رکھتی ہوں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ رائیں پہلے سے بنی بنائی موجود نہ ہوں بلکہ مطالعہ کے دوران میں مخصوص علمی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے قائم کی گئی ہوں۔

مثالیں اتنی ہی دی گئی ہیں جتنی کسی دلیل کے لیے ضروری تھیں۔ حوالے وہیں دیے گئے ہیں جہاں میں نے کسی مصنف یا تصنیف سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔ اس کتاب میں "روحِ ادب" کے علاوہ جوشؔ کی تمام کتابوں کے پہلے ایڈیشن سے حوالے دیے گئے ہیں۔ روحِ ادبؔ کا دوسرا ایڈیشن میرے پیش نظر تھا کہیں کہیں ایک خط کا حوالہ ہے اس کے لیے میں جناب جوشؔ کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ایک بار میری استدعا پر چند سوالات کے جواب مجھے لکھ بھیجے تھے۔

سید احتشام حسین
لکھنؤ

سنہ ۱۹۵۸ء

۱

ذہنی ارتقاء اور شخصیت

انسان کے ذہنی ارتقار اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں جو انفرادی یا اجتماعی قوتیں کام کرتی ہیں یا اس کے شعور پر جو خارجی اور داخلی اثرات اپنا عکس ڈالتے ہیں اور جو جسمانی اور نفسیاتی عناصر اثر انداز ہوتے ہیں ان سب کا شمار کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ ان کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے ہر قدم پر نئی گتھیاں پڑتی جاتی ہیں اور انسان عمل اور ردِ عمل کی وجہ سے عامل اور معمول کے مدارج سے اس طرح گزر جاتا ہے کہ اس کے شعور کی گہرائی میں اتر کر اس کے اصل جذبات کا پتہ لگانا تقریباً محال ہو جاتا ہے لیکن ایک فرد کو لے کر اس کے پورے ماحول میں اس کا مطالعہ کرنے سے بہت سے صحیح نتائج برآمد ہوتے ہیں، اس کے افعال و اعمال، حرکات و سکنات، اثر انگیزی اور اثر پذیری وغیرہ میں ایک ایسی انسانی عمومیت پائی جاتی ہے جسے اس کے دوسرے ابنائے جنس کچھ تو اپنے تجربے کی بنا پر اور کچھ علم کی مدد سے سمجھ سکتے ہیں اس کے محرکات کے سوتے ڈھونڈ اور اسکے خیالات کے ذخیرے تلاش کر سکتے ہیں، انسانی زندگی کے مطالعہ میں سب سے بڑی دشواری اس لیے پیش آتی ہے کہ انسان کی انفرادیت ایک فرد کی خواہشات اور خیالات کا مظہر ہوتے ہوئے بھی سماجی حقائق کی سرزمین میں پنپتی اور نشو و نما پاتی ہے وہ مشین نہیں ہے بلکہ نمو کی غیر معمولی طاقتیں انتخاب و اجتناب کی بڑی قوتیں رکھتا ہے ایک ایسی قوتِ ارادی کا مالک ہوتا ہے جو جبر و اختیار

کی کشاکش میں پرورش پاکر کبھی جذبات کے معمولی جھٹکے میں پاش پاش ہو جاتی ہے اور کبھی بڑے بڑے طوفان کا مقابلہ کرتی اور کامیاب ہوتی ہے۔ اس کی فطرت واقعات و حالات سے اثر لے کر بدلتی رہتی ہے۔ اکثر تو مادّی حالات اسے بناتے اور بگاڑتے ہیں لیکن کبھی کبھی صرف خیال و احساس بھی اس کی دنیا بدل دیتے ہیں۔ جوش کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ کرنے میں ان تمام باتوں کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ شاعر اور فن کار ہونے کی وجہ سے ان کے احساس اور اندازِ نظر میں جو خصوصیتیں عام انسانوں سے مختلف ہیں۔ چاہے وہ کیفیت میں ہوں یا کمیّت میں ——— ان کو بھی نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہیئے۔

شخصیت کی تعمیر میں داخلی اور خارجی، شعوری اور غیر شعوری عناصر کی کارفرمائی، جسمانی، نفسیاتی، ذہنی اور مادّی محرّکات کی اثر اندازی یقینی بات ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان میں کسی تناسب کا اندازہ لگانا تقریباً محال ہے تمام چیزیں ایک دوسرے میں اس طرح گتھی ہوئی ہیں کہ ان کی قوت کا اندازہ الگ الگ لگانا دشوار ہے۔ انسانی شخصیت کی تعمیر کے لیے کچھ مواد تو پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے کچھ وقت اور ماحول فراہم کرتے جاتے ہیں، کچھ چیزیں ساتھ چھوڑ جاتی ہیں کچھ نئی داخل ہوتی جاتی ہیں یہاں تک کہ فرد کا شعور تعمیر و تخریب میں شریک ہو جاتا ہے۔ زمانے سے اثر قبول بھی کرتا ہے اور زمانے پر اپنے نقش بھی چھوڑتا ہے۔ اگر اس کا ذہن متجسّس ہے تو دنیا جہاں تک پہونچ چکی ہے وہ اُس کا وارث بن جاتا ہے، اپنے علم اور شعور کی مدد سے، اپنی قوتِ انتخاب سے وہ اپنے لیے پسندیدہ راستہ تلاش کر لیتا ہے، جہاں تک اس وقت کی دنیا، اس وقت کے عقائد اس کو آسودگی بخشتے ہیں وہ فارغ رہتا ہے اور جہاں سے حالات اس کی خواہشوں اور خوابوں کا ساتھ نہیں دے سکتے وہ خیالی طور پر یا عملاً دنیا کو بدل دینا چاہتا ہے، یہیں اس کے شعور، اس کے رجحان اور اس کے فلسفۂ حیات کی پرکھ ہو سکتی

ہے۔

بہت سے شعرار روایتاً شاعری کرتے ہیں، دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں پر چلتے ہیں، دوسروں کے دماغ سے سوچتے ہیں اور ذہنی طور پر اسی نظامِ زندگی سے وابستہ ہوتے ہیں جنھیں ان کے بیدار مغز اور مفکر پیش روؤں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قائم کیا تھا ان پر غور کرنے کے لیے پس منظر، ماحول، فلسفۂ تغیر پر اتنا زور دینے کی ضرورت نہیں ہے لیکن جوش کی شاعری رسمی نہیں ہے وہ ان کی زندگی کا آئینہ، ان کی شخصیت کا عکس، ان کے شعور کا ملفوظی جسم ہے، ان کے مطالعہ کے لیے ان خارجی اور داخلی محرکات کا سراغ لگانا ضروری ہے جو سوچنے والے دماغ پر ضرور اثر ڈالتے ہیں۔

کسی شاعر کا مطالعہ کرتے ہوئے اصل توجہ کا مرکز شاعر کی ذات کو بنانا چاہیئے یا اس کی شاعری کو؟ یہ سوال مختلف شکلوں میں ہمیشہ نقادوں کے سامنے رہا ہے۔ پھر شاعری میں بھی کسی نے مواد کو اہمیت دی ہے کسی .... نے ہیئت اور اندازِ بیان کو، یہاں اس بحث کو اصولی حیثیت سے پیش کرنا ضروری نہیں صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ جوش کی شاعری کا مطالعہ کرنے میں ان تینوں باتوں کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ شاعر اور اس کی شاعری میں جو تعلق ہے اس کا اعتراف خود جوش نے کیا ہے۔ حقیقی شاعر کی پہچان سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

> "تمام مشہور شعرار کی زندگی، فطرت، سیرت
> اور عادات و اطوار کا غائر مطالعہ کیا جائے اور
> اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جائے کہ ان کی
> ابتدائی زندگی کن مشاغل میں گزری ہے،

اس عہد کے اہم واقعات کیا ہیں؟ نیز سوسائٹی،
وطن، ہمسایوں کی ان کے کردار کے متعلق کیا
رائے ہے؟ اور جب یہ تحقیقات مکمل ہو جائے
تو ملک اپنا فیصلہ سنا دے گا کہ فلاں سچا
شاعر ہے اور فلاں جھوٹا ــــــــــــ"

بدقسمتی سے ہمارے اکثر شعراء کے حالات اس طرح پس پردہ ہیں کہ ان سے نقاب اٹھانا کئی حیثیتوں سے دشوار ہے۔ خود جوش کی زندگی تفصیل سے پیش نہیں کی جاسکتی لیکن وہ اہم واقعات جو ان کے کردار کی تشکیل اور تعمیر میں نمایاں حصہ لے چکے ہیں یا لیتے رہے ہیں بیان کیے جاسکتے ہیں۔

(۲)

جوش افغان النسل ہیں۔ خاندان کی نسلی اور قومی خصوصیات آنے والی نسلوں پر ضرور تھوڑا بہت اثر ڈالتی ہیں لیکن اتنا نہیں کہ فرد کا مطالعہ اسی کی روشنی میں مکمل ہو سکے۔ یہ اثر خون کی راہ سے بھی داخل ہوتا ہے اور احساس کے پردوں کو چیر کر بھی ذہن پر اپنے نقش بناتا ہے۔ اس بات کو بار بار یاد کرنے، دہرانے، اس پر فخر کرنے اور اس کی خصوصیات کو عزیز رکھنے سے صرف فرد ہی کی نہیں کبھی کبھی قوموں کی نفسیات میں خاموش تغیر پیدا ہوتا ہے، ایک انجانا احساس دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے جو دوسرے خیالات اور تصورات کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ خاندانی خامیوں اور خوبیوں کا احساس نفس پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنے میں شدید ذہنی کشمکش پیش آتی ہے۔

جوشؔ کو اپنے افغانی ہونے کا خیال برابر آتا ہے، وہ اپنے آباؤ اجداد کے صاحب سیف و قلم ہونے کا ذکر کرتے ہیں، اُن کی امارت، ثروت، دولت، عیش پرستانہ زندگی، ان کی سخاوت، غربا پروری، شرافت اور شان سے متاثر ہیں جس کی جھلک ان کی سیرت اور شاعری دونوں میں نظر آتی ہے۔

کابلؔ سے ملا ہوا خیبرؔ کا علاقہ ہے وہاں کے ایک مہم جو آفریدی یار بیگ نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کا رخ کیا صفدر جنگ نے اپنی فوج میں ایک معزز جگہ دی۔ یارؔ جنگ نے تلوار کی دھار پر چل کر عزت اور ثروت حاصل کی۔ ان کے پوتے فقیر محمد خاں گویاؔ مختلف جگہوں پر فوجی خدمتیں انجام دینے کے بعد غازی الدین حیدر تاجدار اودھ کے یہاں ملازم ہو گئے۔ ان کے خاندان نے کنوؔل ہار ملیح آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ گویاؔ تلوار اور قلم دونوں کے دھنی تھے، بہت جلد حکومتِ اودھ کے دست و بازو بن گئے۔ اودھ کی حکومت نے اپنے حدود کے اندر علم و ادب کی جو خدمت کی ہے اس میں گویاؔ کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ خود ناسخؔ کے شاگرد تھے لیکن دوسرے شعرا سے بھی محبت اور عزت سے پیش آتے تھے۔ عربی فارسی کا ستھرا ذوق رکھتے تھے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ عربی عربوں کے طرح بولتے تھے۔ اُس عہد کی شاعری کی جو خصوصیات ہیں وہ سب ان کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ گویاؔ کو اس لحاظ سے بھی تاریخ ادب میں اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے "انوارِ سہیلی" کا ایک ملخّص ترجمہ اُردو نثر میں "بستانِ حکمت" کے نام سے پیش کیا۔ مجموعۂ کلام دیوانِ گویا کے نام سے مشہور ہے اور یہ دونوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

فقیر محمد خاں گویاؔ کے بیٹے محمد احمد خاں احمدؔ (جوشؔ کے دادا) بھی شاعر تھے، ان کا ضخیم دیوان "مخزنِ آلام" کے نام سے چھپ چکا ہے

بہت سی خصوصیات ہیں وہ بھی گویا سے ملتے جلتے تھے لیکن نظامِ معاشرت بدل جانے اور اودھ کی سلطنت کی جگہ انگریزی حکومت کے قائم ہو جانے کی وجہ سے اُن کی زندگی کا رخ بدلا ہوا تھا، ان کا جنسی جذبہ بہت قوی تھا اسی لیے اہل و عیال کی تعداد بھی کافی تھی۔ جوشؔ کے بڑے بھائی شفیع احمد خاں ولیؔ نے لکھا ہے کہ ان کے انتقال کے وقت ان کی اولاد میں چھتیس ۳۶ نفوس موجود تھے[1]۔ اور جوشؔ نے "زودِ رنج ادب" (جدید ایڈیشن) کے دیباچہ میں اپنے والد کا قول نقل کرتے ہوئے ان کے اولاد کی مجموعی تعداد سو سے اوپر بتائی ہے صنفی نفسیات پر غور کرنے والے یہی کہیں گے کہ جسمانی طاقت کے اظہار کا موقع میدانِ جنگ میں نہ ملا اس لیے اس نے شہوانی خواہشات کا بھیس بدل لیا۔ جوشؔ بھی اپنے قوی میلانِ جنسی میں اپنے بزرگوں کے خون کی گرمی دیکھتے ہیں اور کسی نہ کسی شکل میں اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔

جوشؔ کے والد بشیر احمد خاں بشیرؔ بھی جن کا انتقال ۱۹۱۶ء میں ہوا شعر و ادب کے دلدادہ تھے۔ انھوں نے بہت کم اشعار کہے ہیں لیکن ان میں گویاؔ اور احمدؔ کے کلام سے زیادہ شگفتگی، بے ساختگی، کیف اور اثر پائے جاتے ہیں ان کے بڑے بیٹے شفیع احمد خاں ولیؔ نے ان کے مختصر کلام کو ترتیب دے کر ۱۹۲۲ء میں کلامِ بشیرؔ کے نام سے شائع کیا۔ مجموعہ کے شروع میں جو حالات لکھے ہیں ان سے بشیر احمد خاں کی علم دوستی، سخاوت، مہمان نوازی، بے تعصبی، وسیع النظری، مروت اور خوش اخلاقی کا پتہ چلتا ہے۔ زندگی اور معاشرت کی یہ وہ قدریں ہیں جو اس وقت اور کسی قدر بدلی ہوئی شکل میں اس وقت بھی شرافت اور انسانیت کا طرۂ امتیاز

---

[1] کلامِ بشیر، مرتبہ ولیؔ ملیح آبادی، لکھنؤ، ۱۹۲۲ء۔

سمجھی جاتی ہیں اور جن کا نام لے کر متوسط طبقہ اپنے لیے ایک سیاسی تخلیق کر لیتا ہے، ایک روایت بنا لیتا ہے جس سے آنے والی نسلوں کا ذہن حالات بدلنے کی صورت میں بھی بہت کچھ متاثر ہوتا رہتا ہے۔

یہ تھا ایک خوشحال، ذی عزت اور علم دوست خاندان جس میں جوشؔ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ گھر میں مال و دولت، نوکر چاکر، عشرت و فراغت کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ بشیر احمد خان اپنے بچوں سے بہت محبت کرتے تھے اس لیے ناز و نعم میں پلے۔ بچپن ہی سے زیادہ وقت لکھنؤ میں بسر ہوتا تھا جہاں دوست احباب اکٹھا ہو کر جوشؔ کو ان کی ریاست اور امارت کا خیال ہر وقت دلایا کرتے تھے۔ نام شبیر حسن خاں رکھا گیا تھا اور ابتداءً تخلص بھی شبیرؔ ہی تھا لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد شبیرؔ سے جوشؔ ہو گئے[۱]۔ عربی فارسی گھر پر پڑھی۔ فارسی سے طبیعت کو خاص لگاؤ تھا پھر مرزا محمد ہادی رسواؔ (صاحب امراؤ جان آدا) کی صحبت نے اس پر اور جلا کر دی۔ مرزا رسواؔ جوشؔ کے پرائیوٹ ٹیوٹر تھے جن سے متاثر ہونے کا اعتراف جوشؔ خود کرتے ہیں۔ جہاں تک باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا سوال ہے، جوشؔ نے اس کی طرف خاص توجہ نہ کی۔ سیتا پور

---

[۱] تخلص کی تبدیلی کے سلسلہ میں ایک دفعہ جوشؔ نے مجھے بتایا کہ ابتدائے شباب بھی نہیں بچپن کے ختم ہونے کا زمانہ تھا۔ شہر میں ایک تھیٹر کمپنی آئی ہوئی تھی چند احباب کے ساتھ رات گئے کھیل دیکھ کر سب واپس آ رہے تھے۔ کچھ اس ایکٹرس کا تذکرہ تھا جس کے حسن سے سب متاثر تھا۔ کچھ شعر و شاعری کا چرچا تھا کہ دورانِ گفتگو میں کسی نے کہا "ہم لوگ بڑے جوش میں ہیں" اس وقت بھلا نہ جانے کیسے اسی وقت یہ طے ہو گیا کہ میرا تخلص اب شبیرؔ کے بجائے جوشؔ ہو جانا چاہیے۔ اس دن سے یہی تخلص ہو گیا۔

لکھنؤ، علی گڑھ اور آگرہ کے مختلف اسکولوں اور کالجوں میں داخل ہوتے رہے لیکن کہیں قدم نہ جما سکے، اس کی وجہیں زیادہ تر جوشؔ کے انفرادی رجحانِ طبیعت اور ماحول میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ لکھنؤ کی تباہ حالی نے لکھنؤ کے اُمراء اور روٴساء کے ذہنوں پر ایک خاص قسم کا مجہول اثر ڈالا تھا، ان کے دماغ میں امارت اور ریاست، شرافتِ خاندانی اور آباؤ اجداد کی عظمت کا احساس اس قدر رچ اور بس گیا تھا کہ وہ نئے حالات میں اپنی شخصیت کو ترقی دینے یا نمایاں کرنے کے ذرائع زیادہ نہ سوچ سکتے تھے، وہ بزرگوں کی عظمت سے اپنے تعلق کو کافی سمجھتے تھے اور اپنی ذات کی نمائش کے لیے ایسے مشغلے تلاش کرتے تھے جن تک عوام کی رسائی نہ تھی۔ جہاں تک تعلیم کے ذریعے شہرت اور عزت حاصل کرنے کا سوال ہے اس میں نچلے متوسط طبقہ کے لوگ اور عوام سبھی آگے بڑھتے دکھائی دیتے تھے۔ اُمراء سازو نادر ہی اس کی طرف متوجہ تھے۔ یہ تو یہاں کی عام فضا تھی جو غیر شعوری طور پر رئیسوں اور رئیس زادوں پر اثر انداز ہو رہی تھی لیکن اگر ہم جوشؔ کے افتادِ مزاج اور ذہنی ساخت کو کریدیں تو اور اسباب بھی ملیں گے۔ اِن اسباب کا تجزیہ جستہ جستہ آگے آئے گا۔

مختصر یہ ہے کہ جوشؔ کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ سینیئر کیمبرج کا امتحان دینے کے لیے سینٹ پیٹرس کالج آگرہ میں داخل ہو گئے تھے لیکن والد کے انتقال نے یہ مہم بھی سر نہ ہونے دی رسمی تعلیم کا یہ حال تھا لیکن جہاں تک علم حاصل کرنے کا تعلق ہے جوشؔ نے مطالعۂ کتب کا سلسلہ برابر جاری رکھا بلکہ اس سے بھی بڑی بات یہ کہ بالکل ابتدا ہی سے زندگی کے رموز اور فطرت کا اسرار سمجھنے کی کوشش شروع کر دی۔ انسانی فکر

سب سے بڑی معلم اور مشاہدہ سب سے بڑی تعلیم ہے۔ کبھی کبھی رسمی اور درسی تعلیم قوتِ مشاہدہ کی باڑھ بالکل کند کر دیتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس سے ذہن میں ہمواری، گہرائی اور وسعت پیدا ہوتی ہے ——— جوش نے بھی بچپن ہی اپنی فکر و خیال کو اپنا رہنما بنایا اور خود اپنا راستہ ٹٹول ٹٹول کر چلنے لگے۔ انھیں ابتدائی کوششوں میں اس جوش کا سراغ بھی ملتا ہے جو اب بھی مشاہدے اور فکر کو اپنا رہنما قرار دیتا ہے۔

جوش نے نو سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ یہ کوئی بڑی تعجب خیز بات نہیں، جوش کے گھر پر برابر مشاعرے ہوتے رہتے تھے، لکھنؤ کے بڑے بڑے شعراء جمع رہتے تھے، مہمان نوازی اور خوش اخلاقی کا امتحان ہوتا تھا، شاعرانہ چشمکیں ہوتی تھیں، ادبی مباحثے ہوتے تھے، اور جوش کا متجسس ذہن ان سے غذا پاتا تھا۔ جوش بہت سی دلچسپیوں کے آدمی آج بھی نہیں ہیں، یہی حال بچپن میں بھی تھا، تفکر پسند ذہن کی یہ خصوصیت بچپن ہی میں نمایاں ہو جاتی ہے اور اکثر و بیشتر شدید ذہنی انقلابات کے باوجود باقی رہتی ہے۔ جوش کے پسندیدہ مشاغل کی فہرست نہ اس وقت لمبی چوڑی تھی نہ آج ہے، کتابوں کا مطالعہ، مناظرِ فطرت کا مطالعہ، نفسِ انسانی کا مطالعہ، دوستوں، شاعروں اور ادیبوں کی صحبتیں، شاعری بس یہ تھے جوش کے مشاغل عمر کے تقاضوں اور زندگی کی ضرورتوں کی وجہ سے ان میں ایسے میلانات کا اضافہ بھی ہوتا رہا ہے جن کا ذکر مناسب مواقع پر آئے گا۔ انھوں نے اسے خود بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے:

——"میں نے نو برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا ——— "شعر کہنا شروع کر دیا تھا"

یہ بات میں نے خلافِ واقعہ اور غلط لکھی کیوں کہ یہ کسی انسان کی مجال نہیں کہ وہ خود سے

شعر کہے۔ شعر اصل میں کہا نہیں جاتا، وہ تو اپنے آپ کو کہلواتا ہے ـــــ اس لیے صحیح طرز بیان اختیار کر کے مجھے یہ لکھنا چاہیے کہ نو برس کی عمر سے شعر نے اپنے کو مجھ سے کہلوانا شروع کر دیا تھا۔ جب میرے دوسرے ہمسن بچے پتنگ اڑانے اور گولیاں کھیلتے تھے، اس وقت کسی علیحدہ گوشے میں شعر مجھ سے اپنے کو کہلوایا کرتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ پتنگ اڑانے اور گولیاں وغیرہ کھیلنے کے فن سے میں اب تک نا واقف ہوں"۔

(روحِ ادبؔ جوشؔ)

یہ بحث تو بعد میں آئے گی کہ شعر اپنے کو کہلواتا ہے یا انسان شعر کہتا ہے، یہاں اتنی بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ جوشؔ بچپن میں عام بچوں سے مختلف تھے اور یہ نتیجہ تھا ان کے فکری اور شاعرانہ میلان کا جس کو سنجیدگی سے زیادہ لگاؤ ہوتا ہے ابتدائے شباب میں یہ سنجیدگی محبت کے تجربہ سے بھی پیدا ہو سکتی ہے چنانچہ جوشؔ تعلیم نہ حاصل کرنے کا اصل سبب عشق و محبت ہی کو قرار دیتے ہیں۔

میں لڑکپن میں جسے عشق کمالات رہا
علم حاصل ہو اسی فکر میں دن رات رہا
بھائی سے کام تھا مجھ کو نہ کسی ہمسن سے
لڑکے کہتے تھے کبھی ہم نہیں کھیلے ان سے

اور اب میں وہی کمبخت کہ پڑھتا ہی نہیں

سامنے علم کا میدان ہے بڑھتا ہی نہیں

(روح ادب ص ۱۴۰)

وہ اس لیے نہیں پڑھ سکتے کہ آنکھوں میں کسی کی آنکھیں سما گئی ہیں ایسی حالت میں

جوش تعلیم کجا، عشق جگردوز کجا!

محفلِ علم کجا، جلوہ گہہِ سوز کجا!

اسباب جو بھی ہوں یہ حقیقت ہے کہ جوش اپنے رسمی مفہوم میں تعلیم کی تکمیل نہ کر سکے۔ تجزیۂ نفس سے دلچسپی لینے والے اس سلسلہ میں موشگافیاں کریں گے اور غالباً یہ کہیں گے کہ چونکہ جوش نے باقاعدہ تعلیم مکمل نہ کی اس لیے اس احساس کمتری کو مٹانے کے لیے اپنی پوری توجہ شاعری کے فن میں کمال حاصل کرنے پر لگا دی۔ احساس کمتری کا یہ تصور اپنی جگہ پر خود محبت کا محتاج ہے کیوں کہ یہ ساری انسانی جدو جہد کو، ساری ارادی کوششوں کو ایک غیر شعوری احساس کا نتیجہ قرار دے دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سماجی زندگی کی ایک منطق ہوتی ہے اسی طرح خاندانی زندگی کی بھی۔ جس کی گرفت سے نکلنا مشکل ہوتا ہے پھر اگر اور اسباب بھی مہیا ہو جائیں تو فرد کے افکار و اعمال کو سمجھنا آسان نہیں رہ جاتا۔ اس لیے یہاں ان تمام پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت نہیں کہ انھوں نے باقاعدہ تعلیم کیوں نہیں حاصل کی۔ جوش کی سوانح عمری میں ان باتوں پر مفصل گفتگو ہو سکتی ہے یہاں تو ان کی زندگی کے انھیں پہلوؤں کو لینا ہے جن سے ان کے ذہنی ارتقا اور ان کی شاعری کے سمجھنے میں مدد ملے۔

جوش نے اپنے بچپن کے واقعات میں ایک ایسے رجحان کا ذکر کیا ہے

جس سے ان کے کردار اور شاعری پر کافی تیز روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

"شاعری سے جب فرصت پاتا تھا تو یہ میرا محبوب ترین مشغلہ تھا کہ ایک اونچی سی میز پر بیٹھ کر اپنے ہم عمر بچوں کو جو جی میں آتا تھا اناپ شناپ درس دیا کرتا تھا۔ درس دیتے وقت میری میز پر ایک پتلا سا بید رکھا رہتا تھا اور جو بچہ توجہ کے ساتھ میرا درس نہیں سنتا تھا اسے میں بید سے اس طرح مارتا تھا کہ بیچارہ چیخیں مار مار کر رونے لگتا تھا اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ میں کسی کند ذہن بچے کے کاندھوں پر سوار ہو کر اسے اس طرح بید مار مار کر دوڑاتا کہ وہ غریب بے دم ہو کر گرنے لگتا ــــ اور میرے مزاج کی یہ وہی بنیادی سختی ہے جو میری سیاسی خطیبانہ شاعری میں تلخ و ترش بن کر آج بھی نمودار ہوتی رہتی ہے اور میری شاعری کا نقاد میرے لہجے کی درشتی پر چیخ چیخ اٹھتا ہے۔"

(روحِ ادب ص ۹)

صرف اتنی ہی بات نہیں ہے، بچپن میں درس دینے کا مشغلہ بڑی عمر میں پیمبری اور رہبری کی خواہش کا غماز ہے۔ بچپن میں جو بچے درس کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے وہ سزا پاتے تھے، آج جو لوگ جوشؔ کی شاعری پر دھیان نہیں دیتے انھیں جوشؔ اپنے مخصوص لمحات میں بھرا،

گونگا، اندھا اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالتے ہیں۔ اس کے علاوہ بید سے مارنے میں بھی گہرے نفسیاتی رمز ہیں جن میں سے بعض طنز، صاف گوئی نازک مزاجی اور کسی حد تک آمریت ایذا دہی میں لذت اندوزی کے جذبات کی شکل میں آج بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ تہذیبی تصورات اور فکری رجحان نے ان کی صورتیں بدل دی ہیں مگر نفسیاتی مطالعہ کی مدد سے انھیں پہچان لینا کچھ ایسا مشکل نہیں ہے۔ سماجی برتری کا احساس مختلف اوقات میں مختلف قسم کے بھیس بدلتا ہے اور جوشؔ کے یہاں ان کی فراوانی ہے۔

(۳)

جوشؔ کی شاعری کی ابتدا غزلوں سے ہوئی۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں گو نظموں کو اچھا خاصا فروغ حاصل ہو چکا تھا لیکن جوشؔ نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں وہاں غزل گوئی کو اہمیت حاصل تھی۔ لکھنؤ میں غزل گوئی کئی ادوار سے گزری تھی بیسویں صدی کی ابتدا میں کبھی سطحی اور کبھی گہری جذباتیت اور رقت پسندی کو فروغ حاصل ہو رہا تھا جوشؔ کی ابتدائی غزلوں میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی

۱۔ مثلاً صد حیف کہ قدرت سے ملا ہے یہ حکم بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا
اندھوں سے جب پڑا ہے زمانے میں ربط اے جوشؔ آپ یوسف کنعاں ہوئے تو کیا

اور بہت سی رباعیاں اور نظمیں

ہے۔ شروع میں جوش کے والد نے انھیں شاعری سے روکا،[1] سمجھایا بجھایا
ناخوش ہوئے لیکن شاعری جوش کے لیے مشغلہ یا وقت گزاری نہ تھی بلکہ
شخصیت کا اظہار اور روح کی آواز تھی اس لیے کمی ہونے کے بجائے
اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب باپ نے یہ دیکھا کہ اب اس آواز کو دبانا
محال ہے تو نہ صرف شاعری کی اجازت دے دی بلکہ لکھنؤ کے
مشہور شاعر مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کے سپرد کر دیا۔ عزیز صرف فنِ
شاعری اور زبان کے ماہر نہ تھے بلکہ اچھے جذبات نگار غزل گو تھے۔ اس
تعلق سے جوش کو زبان و عروض کے نکات معلوم ہوئے ہوں تو معلوم ہوئے
ہوں، فکر و خیال کا کوئی مخصوص رخ ہاتھ نہ آیا۔ مجموعی طور پر ماحول اور
زندگی کا دائرہ اثر وہی تھا۔ بہ قول جوش یہ رشتۂ تلمذ غالباً سنہ ۱۳-۱۹۱۲ء
میں قائم ہوا اور چار پانچ سال قائم رہ کر منقطع ہو گیا۔ اس کی سب سے
بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جوش نئی زندگی کے اثرات آہستہ آہستہ
قبول کر رہے تھے اور عزیز اپنی ذہانت اور جودتِ طبع کے باوجود
بدلتی ہوئی دنیا کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں ملیح آباد
میں سلیم پانی پتی کا قیام تھا، وہ حالی کے پیرو اور جدید ادب کے معماروں میں
سے تھے انھوں نے جوش کی غزل گوئی کی تنگنائے سے نکل کر نظم کے
وسیع سمندر میں کود پڑنے کی تلقین کی۔ جوش نے ایک خط میں مجھے لکھا
ہے کہ "سلیم صاحب نے غالباً سنہ ۱۹۱۴ء میں یا اس سے کچھ پیشتر غزل

---

[1] جوش نے ایک دفعہ بتایا کہ والدہ نے جاسوس مقرر کر دیے کہ میری شاعری کی
خبریں انھیں پہونچائی جائیں چنانچہ داروغہ حامد علی (غالباً یہی نام تھا) کے سپرد یہ
کام ہوا اور اس خبر رسانی کا صلہ فی خبر پانچ روپے مقرر ہوا۔ داروغہ حامد علی نے اپنی آمدنی
بڑھانے کے لیے جھوٹی خبریں پہونچانا شروع کر دیں۔ جہاں مجھے تنہا بیٹھا ہوا دیکھتے فوراً
والدہ کو جا کر اطلاع دیتے کہ شبیر حسن خاں شعر کہہ رہے ہیں۔ انھیں پانچ روپے مل جاتے اور مجھے تنبیہہ

گوئی پر فلک شگاف قہقہوں کے ساتھ مجھے نظم گوئی پر آمادہ کیا۔ اور انھیں کی فرمائش سے، چونکہ وہ محرم کا زمانہ تھا، میں نے سب سے پہلی نظم "ہلالِ محرم" کے نام سے لکھی تھی جو تلف ہو چکی ہے"۔ اس وقت تک جوش کے مطالعہ میں بعض فارسی کے اساتذہ مثلاً خیّام، عرفی، نظیری، سعدی اور حافظ تھے اور اردو نثر و نظم میں داغ، انیس، سرشار اور شرر کا جادو کام کر رہا تھا اور یہ جوش ہی نہ تھے جو ان اساتذہ سے متاثر تھے بلکہ اس عہد کے تمام پڑھے لکھے لوگ ان ادیبوں اور شاعروں کی قدر کرتے تھے۔ ابھی تک نہ تو جوش کا مزاج معین تھا نہ طرزِ فکر لیکن طبیعت کا زور ایک طوفانی سیال مادے کی طرح آگے ہی کی طرف بہتا چلا جا رہا تھا اور تفکر پسند مزاج کا ہیجان کسی ایک مقام پر ٹھہرنے نہ دیتا تھا۔ زندگی کے تجربے محدود تھے، نگاہ کی وسعت محدود تھی، پرواز کی طاقت محدود تھی، بس تصورات کی جولانیاں ہمیز کرتی رہتی تھیں اور وہ کانٹا دل میں کھٹکتا رہتا تھا جو ہر ذہین انسان کے دل میں کھٹک کر اسے خلش کے دور کرنے پر اکساتا رہتا ہے۔ ایک طرف خاندانی خصوصیات کا احساس، دوسری طرف فکر کے تقاضے، ان دونوں نے مل کر وہ کشمکش پیدا کر دی جس سے جوش پوری طرح کبھی باہر نہ نکل سکے۔

جب کہ مدت سے یہی پیشۂ آبا ہے تو ہم
صاحبِ سیف و قلم ہوں تو کوئی ذم ہی نہیں

شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے — یہ مرا فنِ خاندانی ہے

بڑی نمود سے دنیا میں وہ ابھرتا ہے — جو کارخانۂ قدرت میں فکر کرتا ہے

اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے جوشؔ لکھتے ہیں کہ۔

مادی حیثیت سے وہ میری انتہائی فارغ البالی کا زمانہ تھا گھر میں دولت پانی کی طرح بہتی پھرتی تھی اور اس کے دوش بدوش اقتدار و حکومت کا طنطنہ بھی شامل حال تھا۔ زندگی اور زندگی کی تلخیوں سے قطعی ناواقفیت اور دردمند انسانیت کے مشاہدے، نیز حیات کے تلخ تجربات سے کلیتہً بیگانگی تھی۔ البتہ ان تمام فارغ البالیوں کے باوجود مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کوئی شئے رہ رہ کر میرے دل میں چبھا کرتی تھی، وہ "کوئی شئے" تھی کیا مجھے اس کا مطلق کوئی علم نہیں تھا اور اس کے ساتھ مجھے حسنِ مناظر سے خوشی اور حُسنِ انسانی سے دکھ محسوس ہوا کرتا تھا ایسا کیوں تھا، یہ بات میرے دائرہ علم سے خارج تھی ۔۔۔"

(رُخِ ادب ص ۱۱)

جب دل ہر سوال مانگے، جب چیزوں کی حقیقت جان لینے کی پیاس بے چین کرے، اس وقت اگر خارجی دنیا کے حقائق، اس کی کشمکش اور اس کی پیچیدگیاں، نظام حیات کی سماجی گتھیاں اور معاشی حدود نگاہ کے سامنے نہ ہوں انسان داخلی کیفیتوں میں پناہ لینا چاہتا ہے، وہ خیال کی مدد سے حیات و کائنات کے راز سمجھ لینے کا آرزومند ہوتا ہے اور ذہنی تسلی کے لیے کبھی واہمہ کے روایتی

حقائق کے بُت تراش کر انھیں کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ بڑی بڑی باتوں کو چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھتا اور انھیں کی نوک و پلک درست کر کے اُن سے اپنے ذہن کو آسودہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی وہ جانی پہچانی چیزوں میں ذہنی اطمینان کے پہلو تلاش کرتا ہے اور کبھی خیالی دنیا تعمیر کر لیتا ہے جو وقتی تسکین بخشتی ہے۔ چنانچہ جوشؔ نے اپنی فکر کی باگ ..... مذہب کی طرف موڑ دی۔ جوشؔ کے والد بشیر احمد خاں مرحوم کی خود مذہبی ادب اور مذہبی تاریخ سے گہری دلچسپی تھی اس لیے جوشؔ کے اس رجحان کے لیے ایک سے زیادہ اسباب موجود تھے۔ جوشؔ خود اس کیفیت کو کس قدر و فصاحت سے بیان کرتے ہیں اور چونکہ غور و فکر کے ذریعہ تغیر پسندی کا یہ جذبہ داخلیت کے حصار سے انھیں باہر کھینچ لایا اس لیے اس کا مطالعہ جوشؔ کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے۔ لکھتے ہیں:

"نیز اس زمانے میں یادش بخیر، ایک کافی مدت تک میں نماز کا بھی نہایت سختی کے ساتھ پابند ہو گیا تھا۔ نماز کے وقت خوشبوئیں جلاتا اور کمرہ بند کر لیتا تھا اور گھنٹوں رکوع و سجود میں کھویا ہوا رہتا تھا۔ اس دور میں میں نے داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ چارپائی پر لیٹنا اور گوشت کھانا ترک کر دیا تھا۔

ایک مشہور خانقاہ کے سجادہ نشین کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی تھی۔ اور وہ چیز جسے صوفیائے کرام "تجلیات" کہتے ہیں، میرے قلب کو حاصل ہو گئی تھی۔ ذرا ذرا سی بات میں میرے آنسو

نکل آتے تھے اور بالخصوص گریۂ نیم شبی اور آہِ سحری کے
وقت تو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا میرا دل بہہ رہا اور
میرا تمام وجود فضائے نیلگوں میں اڑ رہا ہے لیکن
ان تمام باتوں کے باوجود، دہشت واضطراب کے
ساتھ، کبھی کبھی یہ بھی محسوس ہوتا تھا جیسے میرے
دماغ کے اندر کوئی خطرناک کمانی کھل رہی ہے
جو آخر کار مجھ سے میری اس دنیائے لطافت
کو چھین لے گی۔ چنانچہ وقت گزرتا گیا، کمانی کھلتی
چلی گئی اور کچھ مدت کے بعد مجھ میں ایک قسم کا
ہلکا باغیانہ میلان پیدا ہو گیا اور ترقی کرنے لگا
اور آخر کار نوبت یہ پہنچی کہ میری نمازیں ترک
ہو گئیں، داڑھی منڈ گئی گویۂ نیم باشی اور آہِ سحری
کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اور اب میں اس منزل پر
آگیا جہاں ہر قدیم اعتقاد اور ہر پارینہ روایت
پر اعتراض کرنے کو جی چاہتا ہے اور اعتراضات
بھی تمسخر انگیز واہانت آمیز۔

جب میرے خیالات واقوال کا کارواں اس راستے
پر آہستہ آہستہ گامزن ہونے لگا تو میرے مرحوم چچا
کو سخت اندیشہ ہوا کہ میں گمراہ ہو جاؤں گا انھوں
نے مجھے بڑی نرمی اور احتیاط کے ساتھ سمجھانا اور
ایک مدت تک سمجھانے سے تنگ آکر آخر کار
دھمکانا شروع کر دیا، مگر مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں
ہوا اور آبائی عقائد وروایات سے میری عداوت

بڑھتی ہی چلی گئی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ میرے باپ نے
وصیت نامہ تحریر فرما کر میرے پاس بھیجدیا کہ اگر
اب بھی میں اپنی "ضد" پر قائم رہوں گا تو وہ
اس وصیت نامے کو جس میں انھوں نے مجھے
جائداد سے محروم کر کے میرے نام صرف سو روپیہ
ماہانہ وظیفہ مقرر فرمایا تھا، جج کے آہنی صندوق
میں داخل کر کے میرے مستقبل کو زندانِ محرومی
میں ہمیشہ کے واسطے مقفل فرمادیں گے۔
لیکن مجھ پر اس کا بھی مطلق اثر نہیں ہوا، اور
وصیت نامہ، اس کے دوسرے ہی دن لکھنؤ
کے ڈسٹرکٹ جج کے صندوق میں بند کر دیا گیا
لیکن چھ ماہ کے بعد، جس وقت کہ میں اپنے
کمرے میں دوپہر کے وقت ایک عجیب خواب
دیکھ رہا تھا ماما نے مجھے جگایا اور کہا "میاں
بلا رہے ہیں" چنانچہ میں اپنے باپ کے پاس
پہونچا سر جھکائے ہوئے اور ادب کے ساتھ۔
میرے شفیق باپ نے مجھ سے کہا "شبیر!"
اور میں نے آنکھیں اٹھائیں تو دیکھا بڑی بڑی
غلافی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے ہیں۔
"یہ دیکھو دوسرا وصیت نامہ، میں نے جائداد
میں تمہارا حصہ تمہارے دونوں بھائیوں کے
برابر کر دیا ہے"۔ میرے باپ نے بھرائی ہوئی
آواز میں مجھ سے کہا، مجھ پر باپ کی شفقت

اور اس وقت کی حالت کا یہ اثر پڑا کہ میری ہچکیاں بندھ گییں کہ اتنے میں میرے باپ کی آواز پھر گونجی "شبیر! اس دولت اور جائداد کی خاطر لوگ ماں باپ اور بھائی بہن تک کو مار ڈالتے ہیں یہاں تک کہ ایمان بھی گنوا دیتے ہیں مگر تم نے اس دولت اور جائداد کی اپنے اصول کے سامنے ذرہ برابر بھی پروا نہیں کی، مجھے تمہاری یہ استواری و استقامت بہت پسند آئی، اگر تمھارا سا آدمی بھی ہو جائے تو بھی اس کی عزت کرنا چاہیئے۔"

مجھ پر باپ کی اس حکیمانہ شفقت کا بہت اثر ہوا اور میرا دل باپ کے روبرو اور بھی جھک گیا، لیکن باغیانہ خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ میں اس موقعہ پر جس کو اپنے "باغیانہ خیالات" کا لقب دے رہا ہوں، وہ اس وقت مذہب سے روگردانی اور الحاد نہیں تھا، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آبائی عقائد اور پارینہ روایات کا طلسم باقی نہیں رہا تھا اور اس کی جگہ ایک دوسرا مذہبی اثر میرا احاطہ کر چکا تھا، جس کا ایک رخ تو میرے باپ کو بہت پسند تھا، لیکن دوسرے رخ کی شدت کو وہ نہایت غیر مستحسن خیال فرماتے تھے۔

(روحِ ادب ص ۱۲-۱۱)

یہ طویل اقتباس ضروری تھا کیونکہ جوشؔ کا فطری اضطراب جس سانچے میں ڈھل رہا تھا اس کی اس سے واضح تصویر پیش نہیں جاسکتی۔ جوشؔ اس زمانے میں دنیا کی رہنمائی اور رہبری کرنے کے بجائے اپنے ہی لیے لنگر تلاش کر رہے تھے جس کی مدد سے خیالوں کے طوفان میں ٹھہر جائیں "درس دینے کا جذبہ دبا ہوا پڑا تھا، اپنے لیے راہ ڈھونڈ رہے تھے، چونکہ مادی کشاکش کی طرف سے فارغ البال تھے اس لیے داخلی اور وجدانی تصورات کی جانچ پرتال کر کے یکسوئی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مذہبی ادب کے مطالعہ کے سلسلہ میں آبائی عقائد (طریقۂ حنفیہ اہلسنت) کے متعلق شکوک پیدا ہو گئے تھے لیکن جب تک وہ شکوک رفع نہ ہوں یا ان کی جگہ کوئی دوسرا عقیدہ پیدا ہو کر آسودگی نہ بخشے اس وقت تک ان کا ذہن کس طرح یکسوئی حاصل کر سکتا تھا! اس عہد کی ذہنی کشمکش کا مطالعہ کرنے سے جوشؔ کے خلوص اور "باغیانہ میلان" کا پتہ آسانی سے چل جاتا ہے۔ خیالات میں اختلاف ہونے کی وجہ سے استاد سے بغاوت کی، غزل کی تنگ دامانی سے الجھ کر غزل گوئی سے بغاوت کی، آبائی عقائد اور پارینہ روایات کے طلسم سے غیر آسودہ ہو کر ان عقائد و روایات سے بغاوت کی ۔۔۔ ایسا کرنا درست تھا یا نہیں تھا اس سے بحث نہیں جو نتائج نکلتے ہیں وہ اہم ہیں اور وہ نتائج ہیں ایک قسم کی مفکرانہ آزاد خیالی، جذباتی آسودگی کی تلاش، نئی باتوں کا خیر مقدم کرنے میں بے جھجک ہونا، بت پرستی سے زیادہ بت شکنی کے جذبے کا نمایاں ہونا۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں جوشؔ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ جوشؔ کی زندگی اچانک ایک غیر متوقع موڑ پر آ گئی۔ ان کی لاابالی طبیعت

اور شاعرانہ افتادِ مزاج زمینداری کے خرخشوں سے کسی طرح میل نہ کھا سکتے تھے۔ اعزا اور احباب کی نگاہیں بدل گئیں، نوکروں چاکروں کا اندازِ وفاداری بدل گیا اور جب جوانی کی یادداشت میں شادی ہو گئی تو خانگی زندگی کے جھگڑے بھی سر پر آ پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی حساس طبیعت کو تفکر کے لیے نئی غذا ہاتھ آ گئی۔ گو اب بھی زندگی کی مادی کشمکش کی بھرپور چوٹ نہیں پڑتی تھی لیکن گرد و پیش جو تغیر ہو رہا تھا وہ بہت سبق آموز تھا۔ اعزا کے سلوک انسانوں سے دل پھیرے دے رہے تھے۔ بچپن کی انتہائی پسندی میں شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی اور رہبانیت کا جذبہ اس کی جگہ لے رہا تھا۔ کبیر داس، ٹیگور، حافظ اور خیام مطالعہ میں تھے دنیا بے ثبات معلوم ہو رہی تھی اور زندگی مادی آلائشوں کو ٹھکرا کر آگے بڑھ جانا چاہتی تھی۔ رہبانیت کا جذبہ شدتِ احساس میں داخلی عناصر کے تربیت دینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر انسان خارجی حالات کا مقابلہ نہ کر سکے تو خوشی مفقود ہو جاتی ہے اور انفرادیت روحانیت کا خول اوڑھ کر آسودگی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ روحِ ادب کی پہلی ہی نظم "ترانۂ بیگانگی" اس کیفیت کی ترجمان ہے ؎

مجھ کو ایذا دے، کسی ہستی میں یہ قوت نہیں
دوست یا دشمن کوئی ہو اس قدر طاقت نہیں
حرخدا اب آدمی کی جوشش پر قدرت نہیں
کیونکہ مجھ کو اہلِ دنیا سے کوئی حاجت نہیں

دوسری دنیا میں ہوں دنیا سے میری جنگ ہے
تاج شاہی سے قدم بھی مس کروں تو ننگ ہے

زہر لگتی ہے زمانے کی مجھے آب و ہوا
ظاہری اسباب کو چھوڑے زمانہ ہو گیا

مال و دولت اقربا احباب یار و آشنا چوٹ کھائی جب سے دل پر میں نے سب دیا تج
شمع وہ پردے میں ہے جس شمع کا پروانہ ہوں
انتہا یہ ہے کہ اپنے سے بھی میں بیگانہ ہوں

لوحِ دل پر نقش تھا جب تک کہ یہ مہمل خیال دوستوں کو واقعی مجھ سے محبت ہے کمال
اقربا جذبات کو ہونے نہ دیں گے پائمال خواب میں بھی مجھکو ہو سکیگا نہ اِن سے کچھ ملال
ان پہ میرا حق ہے میرا نور ہے میرے ہیں یہ
ہوں بُرے لیکن میرے حق میں بہت اچھے ہیں یہ

اس خیالِ خام نے کیا کیا نہ کی مجھ پر جفا میں سمجھتا تھا جنھیں سر حلقۂ اہلِ صفا
جانتا تھا جن کو میں جانِ کرم روحِ وفا کہہ نہیں سکتا زبان سے کچھ انھوں نے کیا کیا
کیا بتاؤں سختیاں کیں یا ذرا شفقت نہ کی
مختصر یہ ہے صفائے نفس کی عزت نہ کی

اس نظم میں یہ مصرعے بھی آتے ہیں ع "آدمی کی دوستی کا کچھ نہیں ہے اعتبار"
ع کہتے ہیں جس کو قرابت دشمنی کا نام ہے' ع تا بہ کے یہ رسم الفت' یہ محبت تا کجا'
دنیا سے بیزاری اور بے ثباتیٔ عالم کا احساس کوئی نئی چیز نہیں ہے،
حساس دل معمولی ٹھوکریں کھا کر بیرونی، ماورائی اور ان دیکھی قوتوں کی امداد
چاہتا ہے انسانوں سے بھاگ کر فطرت میں پناہ لیتا ہے اور اس کے ضرر
پہلوؤں کو سراہتا ہے۔ وقتی طور پر سکون حاصل ہو جاتا ہے لیکن جیسے
ہی حقائق اور واقعات کی دنیا نئے سوالات پیدا کر دیتی ہے احساس پھر
کروٹ بدلتا ہے چنانچہ اس زمانے میں جوش نے بھی دنیا سے منھ موڑ کر دنیا

سے انتقام لینے کا تہیہ کرلیا۔ طے کیا کہ ع

سبزۂ بیگانہ کے مانند رہنا چاہیے

اور جیسے ہی یہ فیصلہ کیا دل کی دنیا بدل گئی۔

سانس لی یہ فیصلہ کرتے ہی اطمینان سے — ختم ہوگئے دنیا کے سارے مرحلے
دفعتاً پیدا ہوئے سینے میں تازہ ولولے — مسکرایا میں زمین و آسماں کو دیکھ کے
آئی بوئے دوستی فطرت کے ساماں سے مجھے
لینے آئی اک مہک صحنِ گلستاں سے مجھے

کھل گیا در ناز سے آنے لگی ٹھنڈی ہوا — ساز غنچوں نے لئے گانے لگی ٹھنڈی ہوا
دوست کی خوشبو سے تڑپانے لگی ٹھنڈی ہوا — گیسوؤں میں مجھ کو الجھانے لگی ٹھنڈی ہوا
غنچۂ خاطر کہ مرجھایا ہوا تھا کھل گیا
دل مرا نیچر کے اس پیغامبر سے مل گیا

چھوڑ کر انساں کو میں فطرت کا شیدا ہوگیا — خوبیِ قسمت کہ فوراً ربط پیدا ہوگیا
میرا ہمدم سبزہ زار و کوہ و صحرا ہوگیا — دوست میرا چشمہ و گلزار و صحرا ہوگیا
مجھ کو حلقے میں تبسم نے لیا خورشید کے
شامِ غم رخصت ہوئی جلوؤں میں صبحِ عید کے

دوست یہ ایسے ہیں جو دھوکا نہیں دیتے کبھی
جھوٹ سے واقف نہیں ہے ان رفیقوں میں کوئی

اس دور کی شاعری انھیں خیالات سے بھری ہوئی ہے۔ ایک خاص قسم کا غم ہر وقت احاطہ کئے ہوئے معلوم ہوتا، خدا سے لو لگی ہے، اس کے دل میں اتر

آنے کا انتظار ہے، فطرت بہترین مونس معلوم ہوتی ہے اور زندگی کی لذتوں سے جی اچاٹ ہے۔ ۱۹۱۴ء ہی نہیں بلکہ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان جوش نے جو نظمیں لکھیں ان میں سے بعض کے عنوانات یہ ہیں

"گریۂ مسرت"۔ طوفانِ بے ثباتی"۔ انتظار کے آخر لمحے"۔

دنیا میں آگ لگی ہے میرا دن بہترین خلوت ہے مناسب ہو

تو میرے دل ہی میں چلے آؤ"۔ "سانس لو یا خوش رہو

مجھے تیری نعمتوں کی خواہش نہیں"۔ "دنیا"۔ برقِ عرفاں

پانچ نغمے"۔ "فلسفۂ مسرت"۔

یہ ساری نظمیں صوفیانہ اخلاقی عقائد سے مملو ہیں، ان سے شاعر کے گداز دل اور پرستاریٔ غم کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کی اُس وقت کی زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ خیالات بالکل رسمی نہیں معلوم ہوتے گو جذباتی ضرور ہیں۔ مثال کے طور پر کہیں کہیں سے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں:-

تاریخ اٹھا بتلائے گی وہ دنیا میں خوشی کا نام نہیں
جس دل پہ ہوس کا سکہ ہے اس دل کیلئے آرام نہیں
اس دل سے تعلق ہی جو چیز کہ جانے والی ہے
سامان تعیش جمع کئے جا موت بھی آنے والی ہے
بندے ہو ذرا بھی عقل ہو تجھ میں نام جہاں بن جانا
اللہ اگر توفیق تجھے دے موت سے پہلے مرجانا

عکس آئینہ کے اندر اترا ہی چاہتا ہے
تو عنقریب دل میں آیا ہی چاہتا ہے

قسم اس درد کی جو ہجر کی راتوں میں اٹھتا ہے
قسم اس کرب کی جب روح کھنچ کر لب پہ آتی ہے

کہ یہ دنیا سراسر خواب اور خواب پریشاں ہے
خوشی آتی نہیں سینے میں جب تک سانس آتی ہے

بتیرے انعام کی نہیں خواہش   بلکہ مجھ کو تری ضرورت ہے

کس دوست گم شدہ کو جنگل میں ڈھونڈتا ہے
کس نیند میں ہے بندے! ہر سانس میں خدا ہے

سبق لیتا ہے اکثر معرفت کا فلسفہ ہم سے
کہ ہم ڈوبے ہوئے ہیں جوشؔ روحانی مسائل میں

انداز وادا سے اے دنیا تو لاکھ سنور کر سامنے آ
یہ جوشؔ فقیر آزاد منش کب دھیان میں تجھکو لاتا ہے

اس طرح کی شاعری محض اوقات رسمی خیال آرائی سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن ہم نے دیکھا کہ اس مخصوص زمانے میں ایسی صورتیں فراہم ہو گئی تھیں کہ جوشؔ اسی میں پناہ لیں۔ ابھی تک دنیا اور دنیا کے مسائل نے انھیں اپنی طرف زیادہ متوجہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ ؎ خیالی دنیا میں بستے تھے اور صوفی بن جانے کے متمنی تھے۔ صوفیانہ انداز نظر کے دو پہلو ہوتے ہیں:

ایک تو دنیا سے دنیا سے کنارہ کشی اور بے تعلقی کے جذبہ کا اظہار

دوسرے کائنات اور حیات کے راز جان لینے کی بے چین خواہش کا اظہار۔

جو لوگ عملاً صوفی ہو جاتے ہیں ان میں دوسرا جذبہ یا تو ختم ہو جاتا ہے

یا ہمت کر اپنی ہی ذات میں سما جاتا ہے۔ جوشش گریہ سحری اور آہ نیم شبی کے باوجود عملاً صوفی نہ بن سکے، خود شناسی کی کوشش میں انہوں نے ماحول کو بھی تھوڑا بہت سمجھا۔ حالات ایسے تھے کہ وہ تنہا اپنی ذات کو مرکز بنا کر آسودہ نہیں رہ سکتے تھے۔ خاندانی زندگی میں انتشار تھا، پہلی جنگ عظیم چھڑی ہوئی تھی، جو لوگ اس کے اسباب اور حالات سے پوری واقفیت بھی نہ رکھتے تھے اس کے اثر سے محفوظ نہ تھے، دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ کسی نہ کسی شکل میں جنگ کے دیوتا کو خراج دے رہا تھا جوش نے نگاہ اٹھائی تو اپنے علاوہ اور لوگ بھی غمگین نظر آئے، کچھ جنگ کی تباہ کاری سے، کچھ قحط اور وبا کی تکالیف سے۔ ان کے شاعرانہ احساس نے غالباً پہلی دفعہ اپنی نظم حالات حاضرہ (بہ زمانۂ جنگ) میں واقعات سے آنکھیں چار کیں اور محسوس کیا کہ یہ غم اُن کے ذاتی اور انفرادی غم سے بڑا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہر چیز پر سکوت ہے، ہر شے پہ یاس ہے
غم حکمراں ہے دہر میں دنیا اداس ہے
کشتی رواں ہے زیست کی دریائے زہر میں
بجلی تڑپ رہی ہے مسرت کی لہر میں
سلطاں بڑھے ہیں دہر میں لشکر لیے ہوئے
اور ان کے ساتھ قحط بھی خنجر لیے ہوئے

اب خلق کے اختیار میں قسمت نہیں رہی
ڈوبا ہے رسم تجارت نہیں رہی
خنجر سے غم کے رشتۂ آرام کٹ گیا
شعلے سے آشتی کے اندھیرا لپٹ گیا
ہستی کی مملکت میں تباہی کا راج ہے
ہشیار ہو کہ فرق مصیبت پہ تاج ہے

محویت جنوں میں مری یاس مٹ گئی
دل یوں مٹا کہ قوتِ احساس مٹ گئی
(روحِ ادب ص ۱۳۶)

اس نظم میں کسی قسم کی سیاسی سوجھ بوجھ نظر نہیں آتی۔ لیکن ایک دردمند دل کی دھڑکنیں ضرور سنائی دیتی ہیں۔ ابتدائی دورِ شاعری میں ایسی نظمیں نہ ہونے کے برابر ہیں اس کی وجہیں کچھ ایسی پیچیدہ نہیں ہیں کہ آسانی سے سمجھ میں آسکیں۔ جوشؔ نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس وقت وہ مسائل حیات سے بیگانۂ محض تھے اور یہ جو اتنا بھی زندگی کا تذکرہ آگیا ہے اس کا سبب وہی تجسس پسند اور مسائل متفکرانہ اندازِ منظر ہے جس کا تجزیہ اوپر کیا گیا ہے۔

اب تک جوشؔ کی شاعری کے ایک بہت ہی اہم اور بنیادی محرک کا تذکرہ نہیں آیا ہے اور وہ محبت ہے۔ یہ کچھ اس لیے نہیں کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بلکہ اس لیے کہ ان کی ابتدائی شاعری میں اس کے خط و خال بہت واضح نہیں ہیں۔ کم سے کم ان کے پہلے مجموعے "روحِ ادب" میں جو عاشقانہ شاعری ہے اس کا انداز یا تو رسمی ہے یا طفلانہ اور غیر جلبنی۔ جوشؔ لکھتے ہیں کہ:

"۔۔۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ محبت کی تیز دھار میری رگِ دل کو چھو کر رنگین ہو چکی تھی ۔۔۔"

لیکن اس وقت محبت کے متعلق جوشؔ کے خیالات قدیم صوفیانہ اور اخلاقی تعلیمات سے متاثر تھے چنانچہ خود کہتے ہیں کہ:

"۔۔۔ میں محبت کو جنسیات سے برتر ایک مقدس آسمانی چیز سمجھتا اور محبت کی تلخ شیرینیوں

میں کم ہو جانے کو حیاتِ انسانی کا سب سے
بڑا کارنامہ خیال کرتا تھا۔"

(روحِ ادب ص ۱۱)

محبت کا یہ تصور ان کی غزلوں میں جاری و ساری ہے۔ اس میں جوانی کا التہاب کم بچپن کی معصومیت زیادہ ہے۔ ان کی نظم حقیقتِ دل (روحِ ادب ص ۱۰۴) میں محبت کا سادہ اور پرخلوص اعتراف ملتا ہے، غزلوں کے اشعار میں کہیں کہیں سچی محبت بجلی کی طرح چمک اٹھتی ہے اور جوانی کے رومان کی پُرخلوص جھلک دکھائی دیتی ہے جس میں ایک نیاز مند ہیں ناز برداری کے متمنی عاشق کی تصویر نظر آتی ہے۔ ابتدائی محبت کی یہ کامیابی جوشؔ کی ساری زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے، اُن کے تصورِ عشق و محبت کو ایک خاص رنگ میں رنگ دیتی ہے، ان کے یہاں احساسِ حسن، کیفِ نظر اور رسمِ محبت کی کہانی بالکل دوسری طرح کہی گئی ہے! ابتدائی محبت کی کامیابی کا تصور کرتے ہوئے جوشؔ لکھتے ہیں:

"جی تو بیساختہ چاہتا ہے کہ میں اس اولین واردات محبت کو اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے تمام دیگر واقعاتِ زندگی کو اس دیباچے میں درج کر دوں اور دنیا کو یہ بتا دوں کہ حسن کی زلفوں کی کمندوں نے کتنی بے پایاں نیاز مندیوں کے بعد میرے ناز کو گرفتار کرنے کی سعادت حاصل کی، لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں ان کی جبینِ ناز پر شکنیں نہ پڑ جائیں۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے اس موقع پر صرف اس قدر کہہ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں محبت کے معاملے میں ہمیشہ خوش قسمت

اور عرفی کے اس شعر کا مصداق رہا ہے

آنہا کہ آہوانِ حرم را کنند صید
در آرزوئے ناوکِ صید افگنِ من اند

اور یہی وجہ ہے کہ میری شاعری میں آنسو، آہیں اور سینہ کوبیاں بہت ہی کم ہیں، کیونکہ یہ چیزیں ناکامی اور انفعالیت سے پیدا ہوتی ہیں اور میں ان چیزوں سے شاذ ہی دوچار ہوا ہوں۔"

(روحِ ادب ص ۱۲)

پھر مجھے ایک خط میں لکھا ہے:

"میری بیشتر عاشقانہ نظموں میں اُس چیز کی، لوگ کہتے ہیں، کمی ہے جسے آہ و فغاں اور سوز و گداز کہا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کی ذمہ داری ہے میرے عشق ہائے کامراں پر۔ میرے اٹھارہ۱۸ بڑے بڑے عشقوں میں سے سترہ۱۷ عشق ایسے رہے ہیں جن کا محبوبوں کی طرف سے بھرپور جواب دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ عاشقِ کامیاب آنسوے نہیں بہایا کرتا۔ اور جس کا دعویٰ یہ رہا ہو کہ

آنہا کہ آہوانِ حرم را کنند صید
در آرزوئے ناوکِ صید افگنِ من اند

اس کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ ناکامی کے آنسو بہائے۔ میں "ناکامی" کے آنسو لکھ رہا ہوں اس کا خیال رہے، ورنہ اشکِ عشق کا چولی

دامن کا ساتھ ہے.....

ان عشق ہائے کامراں اور ان کے اثرات پر کہیں اور تبصرہ ہوگا کیونکہ پہلی محبت کے علاوہ اور محبتوں کا تعلق اس دور کی شاعری سے نہیں معلوم ہوتا اور اگر ہے تو بہت ہلکا۔ پہلی محبت ایک انجانے مہمان کی طرح آئی، تیز اور تند طوفان کی طرح آئی۔ چونکہ محبت کی کامیابی یا ناکامی کا کوئی تجربہ نہ تھا اس لیے ابتدائی شاعری میں اس کا بیان رسمی انداز اختیار کرلیتا ہے وہی آہ کا بے اثر ہونا، وہی نالہ و فریاد، وہی گھٹی گھٹی سانسیں، وہی موت کی خواہش، وہی کوئے قاتل کے پھیرے، وہی غم ہجر کی لذتیں، وہی محبوب کے جھوٹے وعدے۔ ہاں کبھی کبھی اس رسمی انداز بیان میں ذاتی تجربوں کا بیان بھی ملتا ہے لیکن انھیں پوری قوت سے پیش کرنے کی صلاحیت ۱۹۲۰ء کے بعد پیدا ہوئی۔ "روحِ ادب" کی اشاعت تک (یعنی ۱۹۲۰ء) جوش کی شخصیت اور شاعری میں ایک حد تک مضبوط لگاؤ پیدا ہو چکا تھا اور وہ اس احساس کے باوجود کہ

اک زمانے سے جدا جذبات کی ترتیب ہے غیر معمولی عناصر سے مری ترتیب ہے

کسی غیر معمولی قوت کا اظہار نہیں کر سکتے تھے، طاقت کا خزانہ اندر چھپا بیٹھا تھا اور اس معدن کو جوش کھود نہ سکے تھے۔ لیکن جن باتوں کا اظہار روحِ ادب کے سرسری مطالعے سے بھی ہو جاتا ہے۔ ان پر پھر نگاہ ڈال لینا آئندہ مطالعہ کے لیے مفید ہوگا۔ جوش رموز حیات و کائنات کو سمجھنے کے صحیح یا غلط کوشش کر رہے تھے تفکر اور تدبر نے انھیں چھو لیا تھا اور وہ اپنی عقل یا اپنے وجدان کی مدد سے زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھنا چاہتے تھے۔

تجربہ کے دشت سے دل کو گزرنے کے لیے

روز اک صورت نئی ہے غور کرنے کے لیے

غور سے دیکھا نظامِ دہر تو ثابت ہوا
آدمی پیدا ہوا ہے کام کرنے کے لیے

ممنون ہوں طبیعتِ محنت شعار کا
ڈالا وہ آفتوں میں کہ انساں بنا دیا

ہم جن تصورات میں رہتے ہیں رات دن
کتنوں کو اس جنون نے بیکار کر دیا

دنیا کو سمجھنا، سمجھ کر عبرت حاصل کرنا، روحانی مسرت کی جستجو، اسے پا کر یا اس کا احساس کر کے لوگوں کو اس سے روشناس کرانا، بزرگوں کے اقوال اور مذہبی صحیفوں کے کلمات کی گہرائیوں میں ڈوبنا، ان تمام باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ انھیں تصورات کی بہتات ہے جن پر نظر رکھ کر اکبر الہ آبادی نے جوش کے متعلق یہ جملے لکھے تھے:

"حقائقِ عالم اور معرفت باری تعالیٰ میں ان کے اشعار نہایت بلیغ اور دلاویز ہوتے ہیں آپ اہل دل بھی ہیں اور اہل زبان بھی۔ میری خوش قسمتی ہوگی کہ میرے بعد آپ ایسے یاد کرنے والے باقی رہیں۔ اس وقت آپ کی طبیعت کا جو رنگ ہے اس پر ایک ازلی پرتو پڑ رہا ہے جس کے لیے صرف شعر ہی کافی نہیں، آپ کو اپنی قدر کرنا چاہیے۔ آپ بہت کچھ ہو سکتے ہیں۔ کوشش کیجیے کہ نماز میں لذت

ملے اور علم باطن حاصل کیجئے کاش کسی وقت
میں آپ اور اقبال یکجا ہوتے۔ آپ کی صحبت
رُوحانی غذا ہے، عبرت، معرفت، بےخودی
جوشِ رُوحانی سے آپ کے اشعار لبریز ہوتے ہیں۔"

جوشؔ سنہ ۱۹۲۰ء میں شانتی نکیتن جا کر ٹیگور سے بھی مل چکے تھے[1] قرآن مجید اور دوسری مذہبی کتابوں کا مطالعہ بھی کر رہے تھے اس لیے اگر ان کی شخصیت اور شاعری میں یہ پہلو نمایاں ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ملیح آباد کی دنیا اور زمیندار خاندان کی فضا میں اس سے زیادہ ممکن تھا تاہم جوشؔ نے مطالعہ اور مشاہدہ کی مدد سے ایک اور دنیا بنائی تھی۔ اس فکری اور فلسفیانہ رجحان کا اندازہ روحِ ادب کے نثری ٹکڑوں اور اقوال وکلمات کے مختصر سے مجموعے مقالاتِ ذریں سے ہوتا ہے جو اسی زمانے میں شائع ہوا تھا۔

اس کے علاوہ حسنِ فطرت اور مناظرِ قدرت سے بھی گہری وابستگی معلوم ہوتی ہے۔ جوشؔ کی فطرت پرستی پر دوسرے ابواب میں نظر ڈالی جائے گی یہاں اس قدر بیان کرنا کافی ہوگا کہ جوشؔ مناظر کے حسنِ فطرت کی معصومیت اور کم آزاری سے متاثر تھے، فطرت کو زندہ اور متحرک سمجھتے تھے اور اسی کے مطالعہ کے ذریعے حقیقت تک پہونچنے کے خواہاں تھے۔ بالکل ابتدا میں صرف حسنِ فطرت کا تذکرہ ملتا ہے آگے بڑھ کر حسنِ انسانی بھی دل پر وار کرتا ہے اور رومانی محبت کا احساس ہوتا ہے جسے وہ غیر جنسی اور مقدس بنائے رکھنا چاہتے تھے۔
جوشؔ کی شاعری کا تاریخی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو سنہ ۱۹۲۰ء

---

[1] جوشؔ نے مجھے خط میں لکھا ہے لیکن یہ سنہ ۱۹۲۱ء بھی ہو سکتا ہے۔

سے ۱۹۲۳ء تک کا زمانہ نظر آتا ہے اس زمانے میں رومانی اور عاشقانہ نظموں کی بھرمار ہے۔ محبوبہ وفا شعار ہے خود راز و نیاز کی سلسلہ جنبانی کرتی ہے، محبّت کی آگ میں جلتی ہے اور اپنے عاشق سے ملنے کے لیے نمازیں پڑھتی اور دعائیں مانگتی ہے۔

میری پرستش اور تیری بزمِ ناز
آفریں اے شاہدِ عاشق نواز
میں سراپا خاک اور میرے لیے
سلسلہ جنبانیٔ راز و نیاز
اک مرے دل کی تسلّی کے لیے
زلزلے ہیں آئے اور تمکینِ ناز
یہ ترا رخ اور رنگینیٔ خستگی
یہ ترے لب اور حدیثِ سوز و ساز
تیرا دامن اور وقفِ اشکِ غم
تیرا سینہ اور بارِ حرفِ راز
جس کے قدموں پر ہو خود فطرت کا سر
وہ پڑھے اور مجھ سے ملنے کو نماز
عاشق نوازؔ (نقش و نگار ص ۱۲۵)

محبوبہ کے انتظار کی تکلیف گو شدید ہے لیکن جب رات بھیگتی ہے تو وہ وعدہ وفا کرتی ہے

کس نے وعدہ کیا ہے آنے کا
حسن دیکھو غریب خانے کا
آج گھر گھر بنا ہے پہلی بار

دل میں سا ہے خوش سلیقگی بیدار
جمع سامان ہے عیش و عشرت کا
خوف دل میں فریب قسمت کا
چشم بر راہ شوق کے مارے
چاند کے انتظار میں تارے
دفعتاً اک چمک سی دوڑ گئی
بام و در پر جھلک سی دوڑ گئی
چھا گئی بام و در پہ رعنائی
دل میں لی ولولوں نے انگڑائی
تار نظروں کے دم بدم کانپے
لڑکھڑائی زباں قدم کانپے
نہ رہا سلسلہ وہ آہوں کا
رشتہ ٹوٹا مری نگاہوں کا
آکے وہ اشک تھم گئے، بارے
چاند نکلا سرک ہوئے تارے
"چاند کے انتظار میں تارے"
(نقش و نگار ص ۱۳۰)

نامہ و پیغام سے محبت کی شدت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، شوق کی آگ بھڑکتی جاتی ہے، روح گھبراتی ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟

۵

دل کی بستی میں کیوں نہ ہو کہرام
آہ یہ نامۂ ہائے یہ پیغام

کاش اسی وقت مجھے موت آجائے
آگ میں پھول کس سے دیکھا جائے
کاش وہ یوں نہ باوفا ہوتی
بانیِ ظلم ناروا ہوتی

(خفائے وفا نقش و نگار ص ۱۳۹)

سنہ ۱۹۲۳ء کی کئی نظمیں کامیاب محبت کی "ایذا دہی" اور "لذت کرب و بیقراری" کی آئینہ دار ہیں۔ پھول، اسے کیا کہتے ہیں، تجاہل عارفانہ سب میں یہی ساز بج رہے ہیں اور جب کچھ دنوں کے لیے جوش چلے جاتے ہیں تو پہلی مفارقت دونوں دلوں میں کہرام مچا دیتی ہے۔

جوش بنگال میں کہتے ہیں:

اے اودھ کی نسیم عقدہ کشا — وہ ملیں تو پیام یہ کہنا
بادلوں کی طرح برستی ہیں — آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں
ایک مدت ہوئی نہیں دیکھا — ہائے تیرا وہ چاند سا مکھڑا
کھائے جاتا ہے کوئی سینے کو — آگ لگ جائے ایسے جینے کو
تنگ ہے سانس آنے جانے سے — اب بلا لے کسی بہانے سے

(پہلی مفارقت نقش و نگار ص ۱۶۲)

اور محبوبہ کہلا بھیجتی ہے:

مجھ کو تری یاد نے ڈبویا — مرجھائی ہوئی کلی ہوں گویا
بھرتی ہوئی چھپا کے سب کو آہیں — ہٹتی نہیں چاند سے نگاہیں
چہرے سے عیاں ہے دل کی الجھن — ڈھیلے ہیں کلائیوں کے کنگن
آنا ہو تو آ کہ دل ہے بے تاب — ایسے میں ابھی چمن ہے شاداب

جلد آکہ فروغِ رنگ و بو ہو　　قبل اس کے کہ خونِ آرزو ہے

زردکلیاں (نقش و نگار ص ۱۴۵)

یوں ہی محبّت جوانی سے خراج لیتی رہی، کامیاب ہو کر بھی کشمکش میں مبتلا کرتی رہی۔ خوشی اور غم کے طوفان اٹھتے رہے، محبت کی ناؤ ساحل اور منجدھار کے درمیان ہچکولے کھاتی رہی یہاں تک کہ محبّت "عقدۂ لاینحل" بن گئی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جوشؔ جس سماجی طبقے سے وابستہ تھے اس کی شریعتِ اخلاق کھلے بندوں محبّت کی اجازت نہ دیتی تھی۔ ملیح آباد کا "رئیس ابن رئیس" جس کی شادی بھی ہو چکی تھی اپنے قبیلے کی گلیوں میں محبّت کے گیت گاتا نہیں پھر سکتا تھا۔ لیکن ایک شاعر جس کی شخصیت تھوڑے دنوں کے لیے محبّت ہی میں مرکوز ہو گئی ہو چپ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ جوشؔ نے اپنے دل کی آواز شعروں میں بند کی، ۱۹۲۴ء میں "عشق کامراں" تھا۔ ان کے ہر قطرۂ خون سے یہ نغمہ اُبل رہا تھا:

محبت کامران و شادماں ہے
بھلا دو قصۂ فرہاد و شیریں

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی سال محبوبہ کی شادی ہو گئی اور آہ یہ جیسے میں بدل گئی، "فریبِ قسمت" کا خوف پورا ہو گیا۔ جوشؔ نے لکھا:

ء

کدھر ہے اے موت آ! کہ غم سے لبوں پہ اب جان آ گئی ہے
وہ شمع جو یادگارِ شب تھی، اسے بھی آندھی بجھا رہی ہے

دہائی حسن خجستہ خو کی اکہ رسمِ عالم کی فتنہ خیزی
چھٹے ہوؤں کو ملا رہی ہے ملے ہوؤں کو چھڑا رہی ہے

ادھر لبفری کی مست لہریں لیے ہوئے ہیں پیامِ شادی
ادھر نسیمِ سحر کی جنبش ترانۂ غم سنا رہی ہے
اُدھر عروسی لباس زر میں دمک رہا ہے کسی کا مکھڑا
ادھر کسی کی خوشی کو دنیا سیاہ کفنی پنہا رہی ہے
اُدھر کلیجے میں تھرتھراتا ہے شعلۂ مرگِ ناگہانی
ادھر شبستانِ رنگ و بو میں حیاتِ نو مسکرا رہی ہے
اِدھر عرق ہے مری جبیں پر، ادھر جھمکتی ہے جوشِ افشاں
ادھر لبوں پر ہیں سرد آہیں اُدھر صبا گنگنا رہی ہے
شادی و مرگ (نقش و نگار ص ۱۵۳)

محبت کامیاب ہو کر بھی پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے ایسی پیچیدگیاں جنھیں حل کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ نفسیات کے اعلیٰ ترین ماہر بھی خوشی اور غم کی اس عجیب و غریب آمیزش کا مکمل تجزیہ نہیں کر سکتے اُن کا بیان کرنا بھی آسان نہیں لیکن جوشؔ کم سے کم اس کیفیت کے اظہار کی کوشش کرتے ہیں:

درسِ عبرت ہے یا اولی الابصار
میرا افسانۂ دلِ بیمار
یہ فسانہ نہیں حقیقت ہے
شاعری سے نہیں مجھے سروکار
دل میں ہیں جذبہ ہائے گوناگوں
الجھی جاتی ہے کاکلِ گفتار

مجھ کو وصل و فراق دونوں رسن
مجھ کو تریاق و زہر، دونوں دار
عہدِ اخلاص توڑنے میں ننگ
رشتۂ شوق جوڑنے میں بھی عار
اُن سے ملئے تو عافیت برباد
اُن سے کھینچئے تو زندگی بےکار

ان کے کھونے پہ بھی نہیں راضی
ان کے پانے پہ بھی نہیں تیار
کون سمجھے گا ان معموں کو
عشق ہی مست عشق ہی ہشیار
عشق ہی ہجر کے لیے بے چین
عشق ہی وصل کے لیے بیمار
عشق ہی راہِ سعی میں خفتہ
عشق ہی بزم فکر میں بے دار

ایک طرف زاہدوں کی مجلس میں
میری غیبت کا گرم ہے بازار
اک طرف عاقلوں کی محفل سے
سخن ناروا کی ہے بوچھار
وضع اہلِ وطن، معاذ اللہ
تہمتوں کے لگادیے انبار
سخت ہیں مجھ پہ کفر کے آئین
تیز ہے مجھ پہ شرع کی تلوار
اک طرف موت، ایک جانب زیست
وہ بہت سہل، یہ بہت دشوار

محبت کی ڈور ہر قدم پر الجھتی جاتی ہے شادی کے بعد محبوبہ وطن سے باہر چلی گئی، جوش دعا کرتے نظر آتے ہیں:

نگارِ رفتہ کو یارب! وطن میں پہونچادے
دوبارہ درِّ عدن کو عدن میں پہونچادے
وطن کی روح کو جسمِ وطن میں واپس کر
غزالِ دشت ختن کو ختن میں پہونچادے
وہ اپنے حسن سے محفل، میں اپنے عشق سے بزم
اس انجمن کو پھر اس انجمن میں پہونچادے
نگارِ رفتہ۔ (نقش و نگار ص ۱۴۱)

جوش کی زندگی میں سنہ ۱۹۲۴ء ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب تک جوش سیر و سفر کے لیے بارہا گھر سے باہر نکلے تھے لیکن

اب دوسری حیثیت سے نکلنا پڑا۔ محبّت کا جو پھندا گلے میں پڑا تھا وہ کھینچ رہا تھا، وہی کشاں کشاں انھیں حیدر آباد (دکن) لے گیا۔ پہلے یہ خیال ہوتا تھا کہ اعزا کی بیگانہ وشی، زمینداری کے کاموں کی الجھن اور محبوبہ کی شادی کا زخم ملیح آباد چھوڑنے کے اسباب ہیں لیکن ۱۹۲۵ء کی ایک نظم "تیرے لیے" اس راز کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ گھر چھوڑنے کے اور اسباب بھی ہیں لیکن اصل سبب محبّت ہے:

ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں اپنے کو تیری راہ میں
پوچھتا پھرتا ہوں میں اپنا پتا تیرے لیے
آہ گو اک عمر سے ہوں میں رئیس ابن رئیس
بن کے نکلا ہوں گدائے بے نوا تیرے لیے
مانگتا ہوں بھیک درویشوں سے تیرے قرب کی
شاہ کے کوچے میں دیتا ہوں صدا تیرے لیے
چاک کر کے میں نے آبائی امارت کا لباس
زیبِ تن کی ہے غلامی کی قبا تیرے لیے[۵]
پھیر لیں آنکھیں مناظر سے ملیح آباد کے
لکھنؤ کی چھوڑ دی آب و ہوا تیرے لیے
(تیرے لیے (نقش و نگار ص ۱۵۵)

---

[۵] میں نے پوچھا تھا کہ زمینداری کے ہوتے ہوئے آپ نے اتنی دُور جا کر ملازمت کیوں کی؟ اس کے جواب میں لکھا ہے کہ "عاشقی کا معاملہ تھا صاحب! سیکڑوں جائدادوں اور جاگیروں کے ہوتے ہوئے بھی عاشق صاحب نوکری کر سکتے ہیں ..... نوکری کے بغیر بھی حیدر آباد میں قیام کیا جا سکتا تھا۔"

اب محبوبہ کا سامنا بھی نہیں ہوتا، اُس کی پرچھائیاں خواب میں آتی ہیں اور "جفائے التفات" کا مارا ہوا عاشق "آرزوئے محروم" کو اپنے سینے سے چمٹائے ہجر کی تکلیفیں برداشت کر رہا ہے

فریاد ہے اے خلوتی پردہ ناموس
کب سے ہوں تری دھن میں گریباں دریدہ
واقف ہے کہ کس طرح سرِ بستر مالش
راتوں کو تڑپتا ہے ترا زلف گزیدہ
دم بھر کے لئے تو کبھی آغوش میں آجا
اے عمرِ رواں! سایۂ آہوئے رمیدہ!
آتا ہوں ترے شہر میں پامالِ ملامت
جاتا ہوں ترے شہر سے دشنام شنیدہ
(آرزوئے محروم۔ نقش و نگار ص ۱۲۹)

اگر یہیں تک ہوتا تو کوئی بات نہ تھی، تھوڑے ہی دنوں کے اندر جوش کو یہ احساس ہو گیا کہ محبوبہ کو اب ان سے محبت ہی نہ رہی۔

ناقابلِ تسخیر، کون لے گیا؟ آتے نہیں ہو تم، اداس صبح، خبر ہے کہ نہیں؟ یہ تمام نظمیں سنہ ۱۹۲۶ء میں لکھی گئی ہیں اور ان تمام نظموں میں یہی خیال مرکزی جگہ رکھتا ہے مثلاً:

ہم نشیں ترکِ وفا پر اُسے توبیخ نہ کر
قید ہوتی ہے کہیں بوئے چمن موجِ گہر
پوچھئے اس دل کو مرے جس نے اُسے رام کیا
اس نے دو دن بھی جو چاہا تو بڑا کام کیا

اے یارِ دل نشیں وہ ادا کون لے گیا؟
تیرے نگیں سے نقشِ وفا کون لے گیا؟
اے شاہِ بندہ پرور سلطانِ نرم دل
دل سے ترے خیالِ گدا کون لے گیا؟
راتوں کو مانگتا تھا دعا میری دید کی
وہ منتیں، وہ ذوقِ دعا کون لے گیا؟

میرے پیامبر کے اٹھاتے تھے پہلے ناز
اب میرے دل کے ناز اٹھاتے نہیں ہو تم
آتی ہیں حسبِ قاعدہ راتیں اسی طرح
لیکن منظر بجائے اب آتے نہیں ہو تم
یک لخت تم نے جوشؔ کو دل سے بھلا دیا
اور اس میں بھید کیا ہے؟ بتاتے نہ ہو تم

اے صبا! کوچۂ جاناں میں گذر ہے کہ نہیں؟
تجھ کو اس فتنۂ عالم کی خبر ہے کہ نہیں؟
اب مرے نام کا پڑھتا ہے وظیفہ کوئی؟
اب مرا ذکرِ وفا وردِ سحر ہے کہ نہیں؟

اور یہ چیز بڑھتے بڑھتے مکمل یاس اور آرزوئے مرگ میں تبدیل ہو گئی۔ ایسی بے دلی پیدا ہوئی کہ جب محبوبہ نے "اعادۂ پیماں" کرنا چاہا تو جوشؔ کی زبان سے یہاں تک نکل گیا:

دم ہی نہیں ہے جوش میں تجدیدِ عشق کا   احسان اب یہی ہے کہ احساں نہ کیجیے

یہ ساری منزلیں کئی سال کے وقفے میں آئیں۔ اس درمیان میں جوشؔ کا ماحول خاصا بدل گیا تھا۔ ملیح آباد اور لکھنؤ ——— چھوڑنے کا جو غم تھا وہ ان کی نظم الوداع سے ظاہر ہے۔ ہر چھوٹی بڑی چیز دامن تھام رہی تھی، رنگین گلستاں، سرزمینِ خنداں، "قیصرِ سحر" (جوشؔ کے مکان کا نام ہے) خموشی، کھلے میدان، آم کے باغ، مست کوئل کی آواز، ہولوں کی چھاؤں، چاندنی راتیں، سب سے رخصت ہونا چاہتے ہیں۔ اس نظم میں یا تو جوشؔ نے ملیح آباد چھوڑنے کا اصل سبب چھپایا ہے یا پھر "فکرِ روزگار" بھی ایک بڑی وجہ تھی کیونکہ "فکرِ دنیا" اور "فکرِ روزگار" کا ذکر بار بار آیا ہے:-

گھر سے بے گھر کر رہی آہ فکرِ روزگار　　سرنگوں ہے فرطِ غیرت سے اب اجداد کا وقار
خلعتِ ماضی ہے جسمِ زندگی پہ تار تار　　پھر بھی آنکھوں میں ہے آبائی امارت کا خمار
شمع خلوت میں ہے روشن تیرگی محفل میں ہے
رخ پہ گردِ بے کسی شانِ ریاست دل میں ہے
آہ اے دورِ فلک تیرا نہیں کچھ اعتبار　　مٹ کے رہتی ہے ترے جورِ خزاں سے ہر بہار
نوعِ انساں کو نہیں تیری ہوا بھی سازگار　　فکرِ دنیا اور شاعر تف ہے اے لیل و نہار
موجِ کوثر وقف ہو اور تشنہ کامی کے لیے
خواجگی رختِ سفر باندھے غلامی کے لیے

الوداع (نقش و نگار ص ۱۰۰)

لیکن باہر نکلنا جوشؔ کے لیے مفید ہوا۔ حیدر آباد میں وہ دار الترجمہ میں "ناظرِ ادب" ہو گئے۔ زندگی کی کشمکش نے نئی صورتیں دکھائیں۔ گھر سے دور ہونے کی وجہ سے دل میں نئے انداز کا گداز پیدا ہوا، صحبتیں بدلیں، ہجر اور ناکامی کے نشتر چبھے، نئے تجربوں کے مواقع ہاتھ آئے۔ آقائی سے غلامی

کی منزل میں قدم رکھنا پڑا۔ شعور کی دنیا بدلی۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۱ء تک ہندوستان میں انقلاب کی زبردست آندھیاں چل رہی تھیں، جنھوں نے اکثر نوجوانوں کو ان کے رنگ محل اور بستر عشرت سے اٹھا کر جد و جہد کے خارزار میں لا کھڑا کیا تھا لیکن ایک رئیس خاندان کے چشم و چراغ، حساس شاعر کی آنکھیں اپنی ہی ذات پر اس طرح جمی ہوئی تھیں کہ اس نے اس طوفان کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ لیکن حیدرآباد کی ریاستی فضا میں آزادی اور غلامی کی کشمکش کے نئے تجربے ہوئے۔ جس کی ناز برداری محبوبہ نے کی تھی، جس کے گرد و پیش ہوا خواہوں اور مصاحبت کا فرض انجام دینے والے دوستوں کا ہجوم رہتا تھا، وہ وطن سے دُور مزدوری کرنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ اس انقلاب کے داخلی احساس کی شہادتیں جوشؔ کے کلام میں ملتی ہیں اور یہی احساس ہے جو نئے حالات کا عطیہ تھا۔ یہی احساس تھا جس نے اُن کی فکر و نظر کی دنیا وسیع کی۔ ملیح آباد، لکھنؤ، اپنی ذات، خاندانی وقار، اعزا کی بے اعتنائی اور محبوبہ کے جورِ التفات سے ہٹ کر نگاہیں "دور انگیز کھلونے" اور "ٹھنڈی انگلیوں" پر بھی پڑیں۔

یہ زمانہ جوشؔ کے ارتقائے ذہن کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کچھ اپنے کام کے سلسلہ میں اور کچھ اپنے ذوقِ تجسس کی تسکین کے لیے جوشؔ کے مطالعۂ کتب کی رفتار بڑھ گئی۔ اب تک جوشؔ نے عام طور سے شعر و ادب کے مطالعہ میں وقت صرف کیا تھا، مذہبی کتابیں پڑھی تھیں، رومانی قصّے کہانی اور افسانے دیکھے تھے، اب تاریخ، فلسفہ، اخلاقیات اور دوسرے علوم و فنون کی کتابیں دیکھنے کے مواقع ہاتھ آئے۔ دارالترجمہ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مترجمین سے تبادلۂ خیال کا سلسلہ شروع ہوا۔ شروع میں حافظؔ، خیامؔ، کبیر داس، شررؔ، سرشارؔ، داغؔ اور انیسؔ کا اثر تھا اب اس میں مومنؔ، غالبؔ اور نظیرؔ

اکبر آبادی، بھی شامل ہو گئے۔ ٹیگور اور اقبال نے متاثر کیا۔ جوش اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "ابتدا میں سٹر رینالڈس، سرشار کی نثر اور داغ دہلوی کی شاعری سے متاثر ہوا، آگے بڑھا تو مومن، میر، غالب اور نظیر اکبر آبادی نے متاثر کیا، پھر ٹیگوریت نے دل میں گھر کیا، اس کے بعد اقبال آئے لیکن چھا نہیں سکے، پھر ورڈس ورتھ کو پڑھا اور اثر قبول کیا۔ پھر گوئٹے نطشے، میکم گورکی، شیلی، وکٹر ہوگو، برگساں شوپنہائر اور کارل مارکس نے متاثر کیا۔ فارسی میں سعدی، خیام، نظیری، عرفی، اور سب سے زیادہ حافظ نے دل پر اثر کیا، جو اب تک ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ہندی میں تلسی داس اور کبیر سے متاثر ہوا" ______

ظاہر ہے کہ اس میں آج تک کے اثرات شامل ہیں اور ہر طرح کے۔ بعض صورتوں میں تو یہ اثرات ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر انسان یوں ہی متضاد خیالات اور اثرات کو قبول کرتا، چھانٹا، الگ کرتا، پسند کرتا اور چھوڑتا آگے بڑھتا جاتا ہے۔ زندگی کے بہاؤ میں بہت سی چیزیں ساتھ ہو جاتی ہیں کچھ دور تک چلتی رہتی ہیں کچھ ہلکا سا اثر ڈال کر الگ ہو جاتی ہیں۔ انسان کمزور جذباتی لمحوں میں بعض باتوں کا اثر قبول کر لیتا ہے، جب غور کرتا ہے تو انھیں ترک کر دیتا ہے۔ کبھی ترک کرتے ہوئے اسے دکھ ہوتا ہے اور خامیوں کو جانتے ہوئے بھی نہیں چھوڑ سکتا، ہر انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ ہر لمحہ وہ مخصوص اصولوں ہی کے تحت سوچے

اور عمل کرے زندگی بہت سے ایسے مواقع فراہم کرتی ہے جہاں اپنے پسندیدہ نظریات کے خلاف بھی کہنا اور کرنا پڑتا ہے لیکن ان باتوں کے باوجود فرد کی شخصیت میں یکسر پراگندگی نہیں ہوتی۔ حیات و کائنات پر غور کرنے والے زندگی کے موٹے موٹے اصول تلاش کر لیتے ہیں جن کی مدد سے وہ ہر واقعہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس طرح ان کے انداز فکر اور طریقِ کار کا ایک راستہ بن جاتا ہے جو ان کے کردار اور ذہن کا مظہر ہوتا ہے۔ خیالات و افکار کے طوفان، واقعات اور حادثات کے عمل اور ردِّ عمل سے ایک ایسی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے جس میں تضاد کی رنگارنگی ماند ہو جاتی ہے اور ایک مخصوص قسم کی یکرنگی کا ظہور ہوتا ہے، غور سے دیکھنے اور کریدنے سے دبے ہوئے رنگ بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جوشؔ کی شخصیت میں ان متضاد عناصر کا ڈھونڈ نکالنا مشکل نہ ہوگا۔ جو مختلف الخیال ادیبوں اور مفکروں کے مطالعہ کا نتیجہ ہو سکتے ہیں لیکن جس وقت ہم ان کے ذہنی ارتقاء کے متعلق فیصلہ کرنے لگیں گے اس وقت یہ پتہ آسانی سے چل جائے گا کہ کس قسم کے اثرات نے ان کی شخصیت اور کردار کی تعمیر میں حصہ لیا ہے۔

مطالعہ کے ساتھ ساتھ مشاہدہ کی قوت بھی بڑھی اور فکر میں گہرائی آئی، انفرادیت پر سماجی حقیقت کا ہلکا سا رنگ چڑھا۔ حیدرآباد کے ریاستی اور پُر امارت ماحول میں زندگی کے نشیب و فراز زیادہ دکھائی دیے۔ مناظر فطرت سے وابستگی جاری رہی، ملیح آباد کی ابتدائی زندگی میں شراب کا ذکر نہ تھا اور اگر تھا تو حافظ و خیام کے اثر سے لیکن اب شراب کا ذکر ایک مستقل موضوع بن گیا۔ ۱۹۲۲ء میں کہا تھا:

ترک کر دوں گا شغل اے ناصح
ہاں سر آنکھوں پہ آپ کا ارشاد

سنہ ۱۹۲۴ء میں:

کشتیِ مے کو اے خدائے صبوح
بخش دے قسمتِ سفینۂ نوح

چشمۂ زندگی ہو مدح سرا
ارغوانی شراب ہو ممدوح

بادہ ہے اس طرف اُدھر کوثر
اِس کو فاتح بنا اُسے مفتوح

آنچ آئے نہ مے پہ اے معبود
تیرے بندے ہیں خستہ و مجروح

اور حیدرآباد کے قیام میں چند جرعے اور پیام کیف کی سی مدہوش کن نظمیں لکھیں۔ اسی زمانے میں جوش نے شعر و ادب کے متعلق بھی اپنے خیالات ظاہر کیے جس میں تصور پرست اور عینیت پسند مفکروں کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر ملہم غیب اور تلمیذ رحمانی تھا۔ جس کے سرحد ادراک تک دوسروں کی رسائی نہ تھی۔ اس کا تجزیہ کسی اور مقام پر کیا جائے گا۔

حساس انسان بہت جلد اثر قبول کرتا ہے، بہت جلد خوش ہوتا ہے بہت جلد رنجیدہ لیکن جو احساس شدید ہوتا ہے وہ دیر تک قائم رہتا ہے۔ کبھی کبھی اس سے بھی تضاد کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں،

یہ تضاد خیال اور عمل کے افتراق کی شکل میں زیادہ موثر طریقے پر ظاہر ہوتا ہے۔ جوش کے یہاں جنون و خرد کی جو کشمکش ہے وہ بھی اس کی مظہر ہے وہ پہلے ہی سے تقدیر پرستی اور مشیت کے کسی قدر قائل تھے لیکن انسان کو مجبور محض نہ سمجھتے تھے

روحِ ادب میں یہ اشعار ملتے ہیں :

تم سے چھٹ رہا ہے زمانہ بہار میں
کیا دخل ہے مشیتِ پروردگار میں

جو مقدر میں ہے وہ ہو کے رہے گا اے جوشؔ
آپ کیوں دل کو پریشان کیے بیٹھے ہیں

لیکن یہ خیال اتنا عام ہے کہ اس کو جوشؔ ہی سے مخصوص کرنا یا ان کے کردار پر اس کے عمل کی جستجو کرنا بے سود ہو گا۔ بعد کی شاعری میں جبر کا تذکرہ اتنا ہے کہ اس کی ابتدا کے متعلق کچھ جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ جوشؔ نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ انسان کی مجبوریوں کی جانب انھیں سب سے پہلے فانیؔ بدایونی نے متوجہ کیا اور یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ لیکن بات اتنی ہی نہیں نہیں ہو سکتی۔ جوشؔ کے داخلی اندازِ فکر میں اس کے لیے پہلے سے وجہ جواز موجود تھی۔ ان کے یہاں اس کی بنیادیں پہلے سے موجود تھیں کہ وہ جبر کو تسلیم کر کے آزاد ہو جائیں۔ ہر شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے جو اس کے اعمال و افعال کو حق بہ جانب ثابت کرے جس سے اُسے ضمیر کی سرزنش سے چھٹکارا مل جائے۔

جوشؔ آزاد خیالی کی طرف ضرور مائل تھے لیکن اس وقت تک مذہبی نظامِ اخلاق کو ٹھکرانے کی جرات نہ رکھتے تھے، ذہن کی اس دوئی کے لیے جبر ہی میں جائے فرار تھی۔ اگر گناہ کو گناہ، برائی کو برائی نہ سمجھتے ہوتے تو بدی کو "بھٹکی ہوئی نیکی"، اور گناہ کو "معصوم ترین انسان" ثابت کرنے کی کوشش نہ کرتے، یہی کوشش اس چور

کی غماز ہے جوان کی رُوح میں چھپا بیٹھا تھا۔ آزاد خیال انسان کو اس کی فکر باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ شراب نوشی کے جواز میں مذہبی کتابوں سے حوالے پیش کرے۔ لیکن جوش ایسا کرتے ہیں۔ خیر یہ بحث یہاں طوالت پیدا کرے گی۔ ذہن نشین صرف یہ کرانا ہے کہ خیال اور عمل کی دوئی یہ بھیس بھی بدلتی ہے اور فلسفہ کی حیثیت سے اسے تسلیم کر لیا جائے تو فکر ونظر کا سارا انداز اس سے متاثر ہوتا ہے جوش نے بھی صرف فانی کے متوجہ کرنے سے نہیں بلکہ اپنی فکر کو ایک فلسفیانہ بنیاد دینے کے لیے جبر کے عقیدے کو تسلیم کر لیا۔

حیدرآباد ہی کے دوران قیام میں جوش نے ہیکل (TAECKEL) کی مشہور کتاب (THERIDDLE OF UNIVERSE) پڑھی جو خدا اور مذہب کی طرف سے مشکوک بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ بعد میں انھوں نے RATIONALIST PRESS کی کتابیں بھی پڑھیں جن میں والٹیئر کے مضامین TOSEPH EXISTECE MAC CABE کی GRANT ALLEN اور THE EXISTENCE OF GOD کی THE VOLON OF THE IDEA OF GOD کو خاص پسند کیا۔ یہ کتابیں کسی مخصوص فلسفہ حیات تک نہیں پہنچاتیں لیکن آزاد خیال ضرور بناتی ہیں۔ جوش کے یہاں بھی یہی ہوا۔ انھیں مذہب کے دعوؤں اور حد بندیوں کا مذاق اڑانے میں مزا آنے لگا۔ ایسے مواقع پر طنز کا حربہ بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے، جوش نے بھی اس اس سے کام لینا شروع کیا، مولویوں، ریاکار زاہدوں، جھوٹے مدعیانِ مذہب کی دھجیاں اڑا دیں، اس خدا کو خدا ماننے سے انکار کیا۔ جو انسانی تخیل کا تراشا ہوا تھا۔ اس خیال میں جبر کی آمیزش بھی ہو گئی تو ایک راستہ اور نکلا، اگر ایسا خدا ہے جیسا کہ ارباب مذہب پیش کرتے ہیں۔ ذاتی اور شخصی

خدا، جس میں "بوئے انسانی" پائی جاتی ہے تو پھر وہ بڑا ظالم اور قہار ہے اس طرح وہ "باغیانہ میلان" جو باپ کی زندگی میں آبائی مذہب کی طرف سے پیدا ہوا تھا خود مذہب کی طرف بڑھنے لگا یہ تجسس پسند اور رومانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ وہ ناآسودہ رہتی ہے:

کسی مقام پہ حاصل نہیں قرار ہمیں
مثالِ جوئے رواں بے قرار ہیں ہم لوگ

روز اک نئی زمیں سے گزرتے ہیں ہر نفس
ملتے ہوئے ہیں موجۂ آبِ رواں سے ہم

اس باغیانہ میلان کا ایک سماجی اور سیاسی پس منظر بھی ہے۔ ہندوستانی سیاست اور سماج میں اصلاح پسندوں کے اٹھائے ہوئے خمیر نے ایک طویل مدت میں نئی انقلابی قدریں پیدا کردی تھیں جن کا ظہور پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہوا تھا۔ برطانوی.... استحصال نے ہندوستانی افلاس کو اس نقطہ پر پہونچایا تھا کہ جس کے آگے صبر و قناعت کی راہ مسدود ہو گئی تھی بین الاقوامی حالات بھی آزادی کی راہ دکھا رہے تھے، اصلاحات کے ساتھ غیر مطمئن نظر نے کسی کو بھی آسودہ نہیں کیا تھا۔ متوسط طبقہ خصوصیت کے ساتھ غیر مطمئن نظر آتا تھا اس لیے بہت سے عناصر نے مل کر ہندوستان کو انقلاب کی راہ پر ڈال دیا۔ رومانی اور تصوراتی تغیر پرستی کی ایک ایسی لہر اٹھی جس نے ادیبوں اور شاعروں کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا۔ شروع میں جوش اس سے بہت کم متاثر نظر آتے ہیں گو بعض

نظمیں سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۲۴ء کے درمیان میں ایسی بھی لکھی گئی ہیں جن سے ان کی اساسی سوجھ بوجھ یا کم سے کم سیاسیات سے دلچسپی کا پتہ چلتا ہے "شکست زنداں کا خواب" (شعلہ و شبنم) پر سنہ ۱۹۲۱ء اور "خدا سے ایک سوال" (نقش و نگار) پر سنہ ۱۹۲۲ء درج ہیں لیکن یہ تاریخیں صحیح نہیں معلوم ہوتیں[1] کیونکہ اس زمانے تک ہندوستان کی تحریک آزادی اور انگریزی سرمایہ دارانہ نظام جوش کے شعور کا جزو نہیں بنے تھے۔ لیکن اگر انگریزوں کی غلامی ایسی اٹل حقیقت تھی جس سے کوئی ہندوستانی

---

[1] جوش کی کتابوں کے جو اڈیشن تاج کمپنی (بمبئی) سے شائع ہوئے ہیں ان میں اکثر و بیشتر نظموں پر تاریخیں دی ہوئی ہیں ان سے مدد لی گئی ہے لیکن یہ تاریخیں بعض جگہ غلط ہیں۔ مندرجہ بالا دو نظموں کی تاریخیں بھی صحیح نہیں معلوم ہوتیں کیونکہ ان کے انداز بیان اور موضوع دونوں میں ایسی پختگی اور تندی پائی جاتی ہے جو سنہ ۱۹۲۵ء کے پہلے نظر نہیں آتی۔ شکست زنداں کا جواب تو سنہ ۱۹۳۱ء کی معلوم ہوتی ہے شعلہ و شبنم میں جو حصہ اصلامیات کے عنوان سے ہے۔ اس پر لکھا ہے کہ یہ تمام نظمیں سنہ ۱۹۲۷ء کے پہلے لکھی گئیں (تاج کمپنی بمبئی ڈیلی) لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ اس میں مولانا محمد علی مرحوم پر بھی ایک نظم ہے اور مولانا محمد علی کا انتقال سنہ ۱۹۳۱ء میں ہوا اسی طرح ذاکر صاحب سے خطاب سنہ ۱۹۳۱ء کے قریب لکھی گئی۔ پیغمبر اسلام حیدرآباد کے قیام کے بالکل آخری زمانے یعنی سنہ ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء میں لکھی گئی۔ یا تو جوش کو سہو ہوا یا پھر کتابت کی غلطیاں ہیں۔ اس طرح کی غلطیاں بھی ملتی ہیں جن سے کتابت ہی کا شک ہوتا ہے۔ ایک ہی نظم شعلہ و شبنم اور حرف و حکایت دونوں میں ملتی ہے۔ بیدار کرنے کے عنوان سے شعلہ و شبنم میں ۱۹۳۵ء کے ساتھ درج ہے نوجوانوں سے خطاب کے عنوان سے حرف و حکایت میں سنہ ۱۹۲۷ء کے ساتھ درج ہے۔

آنکھیں چرا نہیں سکتا تھا۔ ہر قدم پر افلاس، جہالت، بیماری، غلاظت گھٹی گھٹی سانسیں، رکی رکی آہیں، ہر موڑ پہ ویرانی، بربادی اور تباہی پھر تقابل اسے اور نمایاں کرتا تھا، انسانوں کی خود غرضیاں اور بے لوث قربانیاں، وطن پرستی اور جماعت بندیاں، وفاداریاں اور بے وفائیاں، اتحاد و افتراق مرض کے احساس میں اضافہ کرتے تھے۔ انگریزی سامراج کے خلاف جس متحدہ قومیت کا ظہور ہو رہا تھا اس سے مستقبل کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں اور وہ تمام لوگ جو آزادی کے خواہاں تھے مذہبی تنگ نظری اور فرقہ وارانہ ذہنیت کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن سامراجی سازشوں، طبقاتی خود غرضیوں اور قدیم تہذیبوں کو رائج کرنے کی تمناؤں نے متحدہ قومیت کے تصور کو کاری ضرب لگائی اور اتحاد پیدا نہ ہو سکا جو غلامی کی رسّی کو توڑ دیتا۔ جوشؔ ان باتوں سے بالکل بیگانہ نہ تھے انھوں نے اپنی انسان دوستی کا ثبوت پہلی جنگ عظیم اور ۱۹۱۸ء کی خشک سالی پر نظم لکھ کر دیا تھا، انھوں نے وطن سے وعدہ کیا تھا کہ تیری خدمت میں جان دے دوں گا۔ (وطن، شعلہ و شبنم) اب جو دنیا بدلی اور آزاد خیالی پیدا ہوئی تو ایک غلام ملک کی فریاد بھی سنائی دی۔ اور شاعر کی حیثیت سے انھیں اپنے فرض کا احساس ہوا:

ے

تڑپ کے مجھ کو پکارا ہے ملک و ملت نے
اب آج سے مجھے پروائے ننگ و نام کہاں
ہوا ہے حکم کہ بے کام موجِ صرصر سے
اب اختلاطِ نسیم سبک خرام کہاں

ہوا ہے حکم کہ بن راز دارِ آتش و برق
اب آب چہرۂ خوبانِ لالہ فام کہاں
نظر ہے اوج پہ جنبش میں پر پرواز
بساط خاک پہ اب فرصتِ قیام کہاں
تغیرات کی رو سے گذر رہی ہے نگاہ
اب اہتمام تماشائے حسنِ بام کہاں
لبِ حیات نے چھیڑا ہے قصۂ خونیں
مری زبان کو اب رخصتِ پیام کہاں
چلا ہوں سر بکف اس سمت آج خود ہی جوشؔ
اب آرزو کو سرِ نامہ و پیام کہاں
(ترک جمود (شعلہ و شبنم ص۲۲۶)

یہ ایک رومانی خیال پرست ․․․․․ کا عزم عمل ہے، وہ چہرۂ خوباں اور تماشائے حسن بام کو ترک کر کے ملک و ملت کی آواز پر لبیک کہنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن خیال میں تو وہ لب حیات کے قصہ خونیں سنتا رہا، عمل میں چہرۂ خوباں اور تماشائے حسن بام میں الجھا رہا۔ انقلاب لانے کے لئے چہرۂ خوباں سے منہ موڑ لینا ضروری بھی نہیں ہے لیکن جوشؔ کے یہاں ہر جذبہ کا ردعمل شدید ہوتا تھا، اس لمحہ میں جب اُن پر ترکِ جمود کا جذبہ طاری ہوا محبوبہ کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ بہرحال سنہ ۱۹۲۵ء سے ان کے کلام میں ملکی اور قومی مسائل نے بھی جگہ پانا شروع کر دیا۔ تھوڑے دنوں میں وہ ایک انقلابی مجنون اور انتہا پسند بت شکن کی طرح اپنی نظموں کے تیز اور زہریلے نشتر لیے ہوئے میدان میں اتر آئے۔ اس طرح چیختے چلاتے، توڑتے

چھوڑتے آگے بڑھنے لگے کہ انقلاب ایک خیالی ارادہ معلوم ہونے لگا۔ جوش اس پرخلوص سپاہی کی طرح گولیاں چلاتے رہے جو جنگ فتح کرنے کی دھن میں اتنا دیوانہ ہو چکا ہے کہ نہ اپنے ساتھیوں پر نگاہ رکھتا ہے، نہ میدانِ جنگ کی شاطرانہ چالوں سے کام لیتا ہے اور نہ جنگ کے دوسرے محاذوں کی حالت سے واقف ہے۔ سیلاب و صرصر کی طرح ہر وادی و کہسار پر چھاتے چلے گئے۔ بوڑھوں کی انجمن میں یہ نعرہ لگایا ؎

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

غلاموں سے یہ کہا ؎

اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ
شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لیے نگاہ

شریکِ زندگی سے یوں مخاطب ہوئے ؎

اے شریکِ زندگی! اس بات پر روتی ہے تو
کیوں مرا ذوقِ ادب ہے مائلِ جام و سبو
کس لیے اس پر نہیں روتی کہ ہے گرمِ فغاں
سبحۂ و زنار میں جکڑا ہوا ہندوستاں

"نازک اندامانِ کالج" کو اس طرح آواز دی ؎

دیر سے توپوں کے منہ کھولے ہوئے ہے روزگار
سینۂ گیتی میں ہے جس کی دھمک سے خلفشار
شغلِ زینت سے مگر فرصت تمھیں ملتی نہیں
کیا تمہارے پاؤں کے نیچے زمیں ہلتی نہیں

مسلمانوں سے کہا ؎

ہاں خود وزرہ بھی تو ہے اسلام کا زیور
باندھے گا فقط جامۂ احرام کہاں تک

ہندوؤں کو یوں للکارا ؎

بازوئے زر! ناخدائی کے لیے تیار ہو
ڈوبنے والی ہے کشتی قوم کی ہشیار ہو

اور دونوں کو یوں مخاطب کیا ؎

توڑ اس جال کو جکڑے ہے جو بازو تیرے
بستۂ کشمکشِ سبحہ و زنار نہ بن
پست سے پست ہو جو چیز وہ بن جا لیکن
مر کے بھی جنسِ غلامی کا خریدار نہ بن

یوں جوشؔ کے سینے میں وطن پرستی اور قوم پرستی کا طوفان اُبل پڑا۔ غلامی سے نجات۔ ہندو مسلم اتحاد، عمل، انقلاب انھیں کے گیت ان گنت راگوں میں گانے لگے اور جب ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں کانپور میں زبردست فرقہ وارانہ ہنگامہ ہوا تو جوشؔ کے انقلابی نعرے سرسامی چیخوں میں تبدیل ہو گئے ؎

اے سیہ رو، بے حیا، وحشی، کمینے بدگماں
اے جبینِ ارض کے داغ اے دنیٔ ہندوستاں
تجھ پہ لعنت اے فرنگی کے غلام بے شعور
یہ فضائے صلح پرور، یہ قتالِ کانپور
تجھ کو عورت نے جنا ہے جھوٹ ہے یہ اے لعیں
آدمی کی نسل سے اور تو! نہیں، ہرگز نہیں

تیری جانب اٹھ رہی ہے دیکھ دوزخ کی نگاہ
سبحہ و زنار میں جھگڑے ہوئے دیوِ سیاہ
تو ابھرتے ہی زمانے کی نظر سے گر گیا
یوں بہایا خون، امیدوں پہ پانی پھر گیا
رکھنے ہی والا ہے آزادی کا جاں پرور جہاد
اے فرنگی شادماں باش و غلامی زندہ باد!
مقتلِ کانپور (شعلہ و شبنم ص۵۰)

یہ عجیب و غریب زمانہ ہے جوشؔ کے لیے! رندی اور سرمستی عروج پر ہے، وطن پرستی ترقی کر رہی ہے، مذہب کی حدبندیوں سے زندگی گھٹتی معلوم ہوتی ہے، خدا کی حقیقت واضح نہیں، انسان مجبور نظر آ رہا ہے، آزادی اور حبِّ وطن کا جو جذبہ وہ پیدا کرانا چاہتے ہیں لوگوں میں پیدا نہیں ہو رہا ہے جنھیں اسی طرح دلآویز ہیں، شامیں اسی طرح سلونی، برسات میں کوئل اور پپیہے کوکتے اور مور جھنکارتے ہیں۔ نشاط اور لذت پرستی کا ٹھکانہ نہیں ہے آبا و اجداد کی عزت اور عظمت کا خیال بھی آتا ہے، ملک کے افلاس پر دل بھی روتا ہے۔ بھرپور جوانی محبت کی تلاش میں ہے۔ مسائلِ حیات ادھر سے نگاہیں کبھی ہٹا دیتے ہیں، ہندوستان ایک کوہِ آتش فشاں کی طرح سلگ رہا ہے۔ کبھی کوئی سیاسی تحریک اٹھ کر منزل پر روشنی ڈال دیتی ہے، کبھی فرقہ وارانہ فساد آزادی کے جہاد کو آگے بڑھنے سے روک دیتے ہیں۔ جوشؔ ان شاعروں میں سے نہیں ہیں جو آنکھیں بند کر کے سوچیں۔ ان کی نگاہ ہر چیز پر جاتی ہے، وہ ہر معاملے میں رائے دینا چاہتے ہیں، ان کی شہرت بڑھ

رہی ہے۔ اقبال کے نام کے بعد انھیں کا نام لیا جا رہا ہے، قوم پرست انھیں اپنی آنکھوں کا تارا بنانا چاہتے ہیں، رند انھیں سند صدارت پیش کرتے ہیں ـــــ ان تمام باتوں کا احساس جوش کو بھی ہے بعض مسئلوں پر وہ واضح خیالات رکھتے ہیں، بعض سیال حالت میں ہیں۔ ہر خیال نیا خیال پیدا کرتا ہے، ہر خیال کی مادی اور سماجی بنیادیں ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس دور میں جوش کی نگاہ ان مادی اور سماجی بنیادوں تک نہ جاتی تھی اور اگر جاتی بھی تھی تو انسان دوستی اور وجدان کی راہ سے۔

اس ماحول اور زندگی میں جوش کی ذہنی کیفیات اور نفسیات کا مطالعہ کافی پیچیدہ نظر آتا ہے، غم میں خوشی اور خوشی میں غم کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں، مستقبل کے متعلق کبھی امید ہے کبھی ناامیدی۔ انہیں آویزشوں سے جوش کی اس دور کی شاعری بھری پڑی ہے۔ جذبات اور احساسات کی تند و تیز رو کو سماجی حقائق کی راہ پر لانے کی کوشش نظر آتی ہے کیونکہ فلسفہ اور سائنس کے مطالعے نے خیال اور احساس کی مادی اور سماجی بنیادوں کی جانب بھی کسی قدر ذہن کو منتقل کیا تھا۔ اب تک جوانی کا مصرف صرف یہ نظر آتا تھا کہ اسے محبت کی نذر کر دیا جائے، اب میدانِ عمل میں سر بکف آنے کا دھیان بھی پیدا ہوتا ہے، اب تک زندگی صرف بزم ناؤ نوش تک پرواز کرتی تھی۔ اب انھیں زندہ رہنے ـــــ کا خیال بھی آتا... ہے، عورت اب تک صرف محبوبہ تھی اب اس کی ضعیفی اور جفاکشی بھی اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ اور خواہش نے ان کی دنیا اتنی وسیع کر دی کہ ہر چیز ان کے لیے شاعری کا موضوع بن گئی۔ یہاں تک کہ گرمی

مذہب سے جوشؔ دور ہٹتے جا رہے تھے لیکن اسلام کی بعض مقتدر ہستیوں کی زندگی کے وہ رخ جو ان کے نقطۂ نظر کے واضح کرنے میں معین تھے وہ خاص طور سے پیش کر رہے تھے۔ آزادی وطن سے محبت، غلامی سے نفرت، رسمی ظاہر پرستیوں سے اختلاف ہمت، جرأت اور شرافت کی تلقین، مذہبی رہنماؤں کی زندگی میں جہاں یہ پہلو دکھائی دیتے تھے۔ جوشؔ انھیں پیش کر کے تمام لوگوں اور خاص کر مسلمانوں کو جنگ آزادی کے قریب لانا چاہتے تھے۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کا جہاد آزادی ایک خاص منزل پر پہونچ گیا تھا۔ قوم پرستوں نے "آزادی کامل" کا اعلان کیا تھا۔ جوشؔ نے بھی اسی سال اپنی نظم "خریدار تو بن" کا پہلا شعر یوں لکھا ؎

اے دل آزادی کامل کا خریدار تو بن
پہلے اس کا کل بچاں کا گرفتار تو بن

سائمن کمیشن اور گول میز کانفرنس کے بہت سے کھیل کھیلے گئے لیکن آزادی کے دیوانے ہر سامراجی چال اور ہر جال سے بچتے رہے جوشؔ بھی ان چالوں سے واقف تھے۔ "زوال جہانبانی" (سنہ ۱۹۲۸ء) میں لکھا ہے ؎

اٹھائے گا کہاں تک جوتیاں سرمایہ داری کی
جو غیرت ہو تو بنیادیں ہلا دے شہریاری کی
نہ ہو مغرور اگر مائل بہ نرمی بھی ہو سلطانی
کہ یہ بھی ایک صورت ہے تجھے بزدل بنانے کی
گئے وہ دن کہ تو زنداں میں حب آنسو بہاتا تھا
ضرورت ہے قفس پر اب تجھے بجلی گرانے کی

تڑپ، بہم تڑپ اتنا تڑپ برقِ تپاں ہو جا
غدار اے زمینِ بے حقیقت آسماں ہو جا

سائمن کمیشن کے آنے کے وقت لکھا:

لگی ہے گھات میں مدت سے تیری — فرنگی کی نگاہِ جاودانہ
عدو تیری گرفتاری کی خاطر — مہیا کر رہا ہے آب و دانہ
اگر جینا ہے آزادی سے تجھ کو — سنا دشمن کو بڑھ کر یہ ترانہ

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

(حافظ)

دام فریب (شعلہ و شبنم)

بہر حال ہندوستانی رہنما سامراجی دامِ فریب میں نہ آئے اور سول نافرمانی اور قانون شکنی کی وہ تحریک شروع ہوئی جو تاریخ انقلاب میں یادگار رہے گی۔ قید، قتل، خون اور ضبط املاک کا بازار گرم ہوا۔ جیل خانے بھرے جانے لگے بڑے بڑے ہمت والے خاموش ہو گئے، لیکن جوش نے ۱۹۳۱ء میں لکھا:

نکلا فضا پہ صبح کا وہ نقرئی جلوس
گل بانگِ طائرانِ خوش الحاں لیے ہوئے
یہ رنگ کیا ہے کشور ہندوستاں کا آج
ہر ذرہ حقیر ہے بستاں لیے ہوئے
ان جالیوں پہ محبس تاریک کی نہ جا
یہ جالیاں ہیں جنبشِ مژگاں لیے ہوئے

ان گردشوں کو اہلِ قفس کی سبک زباں
یہ گردشیں ہیں موجۂ طوفاں لیے ہوئے
ظاہر میں بزدلی ہے یہ درماندگی مگر
یہ بزدلی ہے جنگ کا ساماں لیے ہوئے
آزادیوں کے دیکھ رہا ہے لطیف خواب
زندانیانِ عشق کو زنداں لیے ہوئے

زنداں کا گیت (شعلہ و شبنم ص ۴۷)

آزادی کا تصور واضح ہوا تو طبقاتی تضاد بھی نمایاں ہو گیا۔ یوں تو کچھ دنوں سے ہندوستان میں علمی حیثیت سے اشتراکیت کا چرچا تھا، سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کسان کا مقابلہ کیا جا رہا تھا لیکن عملی سیاسیات میں ان خیالات کا اظہار برائے نام ہوا تھا، اصلاحی سطح نظر انقلابی ہوتا جا رہا تھا جوش نے بھی اس زمانے میں جو نظمیں لکھیں ان میں اشتراکی رجحان پایا جاتا ہے۔ جوش کی ذہنی ساخت اور انسان دوستی کا یہ منطقی نتیجہ تھا کہ وہ خوب سے خوب تر کی طرف بڑھیں، جو چیز انسانی ترقی کی سست رفتار کو بڑھائے اس کا ساتھ دیں۔ تحریک آزادی کی رفتار جن عملی دشواریوں سے دوچار ہو رہی تھی جوش کا ذہن ان سے آزاد تھا اس لیے وہ ہر قدم پر قوم پرستوں کے ساتھ ہی نہیں چل رہے تھے بلکہ کبھی کبھی ان کے آگے بھی نکل جاتے تھے وہ شاعری کو پیغمبری سمجھ رہے تھے اس لیے صرف عوام ہی نہیں سیاسی رہنماؤں کی رہبری بھی کرنا چاہتے تھے۔

ریاست حیدرآباد کی تنگ و تاریک فضا اس شعلے کو بہت دنوں تک اپنے دامن میں جگہ نہیں دے سکتی تھی۔ جوش کی آتش نوائی ایک

طرف شہر یاری اور سرمایہ داری، حکومت اور اقتدار پہ آگ برسا رہی تھی تو دوسری طرف ارباب مذہب بدظن ہو رہے تھے۔ ریاستوں میں سازشوں کا جال بچھا لینا، مطلق العنان امیر ریاست کو کسی ایک وظیفہ خوار سے برگشتہ کر دینا بہت آسان ہوتا ہے، یہ کھیل وہاں ہر وقت کھیلے جاتے ہیں چنانچہ جوشؔ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ حیدر آباد میں دس سال قیام کرنے کے بعد جوشؔ کو وہاں سے علیحدہ ہونا پڑا۔ وہی نظام، امراء، جاگیر دار اور حکام جو جوشؔ کی شاعری کے دلدادہ اور ان کی صحبت کے خواہاں تھے، ان سے آنکھیں چرا کر الگ ہو گئے اور "عتاب شاہی" نے جوشؔ کو چند گھنٹوں کے اندر ریاست کے حدود سے باہر نکل جانے پر مجبور کیا۔ لا مذہبیت، دہریت اور آزاد خیالی کے ساتھ ساتھ ان پر اپنے اشعار میں نظام حیدر آباد کی توہین کرنے کا الزام لگایا گیا اور جوشؔ مورد عتاب ہو گئے۔ حیدر آباد چھوڑتے وقت جوشؔ کی سب سے بڑی آزمائش محبوبہ سے رخصت تھی۔ یہ غالباً جوشؔ کا اٹھارواں اور آخری عشق تھا لیکن پہلے ہی عشق کی طرح شدید اور طوفانی، اسی طرح کامیاب، مگر آنسوؤں اور آہوں میں ڈوبا ہوا۔ شاہی حکم ہے کہ کوئی رخصت کرنے اسٹیشن پر نہ جائے مگر محبوبہ آتی ہے۔ اس کی یادگار جوشؔ کی خوبصورت نظم "شامِ رخصت" (آیات و نغمات) ہے ؎

مجھ سے رخصت کی وہ شام اشک افشاں ہائے ہائے
وہ اداسی وہ فضائے گریہ ساماں ہائے ہائے
وہ مرے سینے میں سیلِ آب و آتش الاماں
وہ ترے چہرے پہ موجِ برق و باراں ہائے ہائے
وہ جدائی کی ہوا کے تند جھونکے وائے غم

وہ جوانی کا چراغِ زیرِ داماں ہائے ہائے

حسرتِ دیدار یاں ہر آن بیتاب و شدید
فرصتِ نظارہ واں پیہم پرافشاں ہائے ہائے

ہاں لرزتا ساغرورِ عزم و ہمت الحذر
وہ جھجکتی سی نگاہِ فتنہ ساماں ہائے ہائے

ہاں کفِ پا چوم لینے کی بھی سی آرزو
واں بغل گیری کا شرمایا سا ارماں ہائے ہائے

تمتماتے ولولوں کی آنچ، اور تیری جبیں
سنسناتی آنچ اور میرا گلستاں ہائے ہائے

میں سراپا سازِ عشرت، اور رہینِ دردِ غم
تو مجسم ناز کی اور بارِ حرماں ہائے ہائے

وہ مری نظروں میں کچھ کہنے کی حسرت دائے شوق
وہ تری آنکھوں میں کچھ سننے کا ارماں ہائے ہائے

اللہ اللہ آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کہنا ترا
جوشؔ! میرا دل ہوا جاتا ہے ویراں ہائے ہائے

اے فغاں برلب ترنم، اے خزاں برکف بہار
جوشؔ تیرے دل کی ویرانی کے قرباں ہائے ہائے

حیدرآباد چھوڑتے وقت اپنے اور محبوبہ کے دل کی ویرانی کے سوا اور کوئی غم نہیں ؎

جس دن ہوا تھا کوچ دیارِ حبیب سے
میں کس قدر تھا بے سروساماں نہ پوچھئے
ہنگام الوداع کسی دوشِ ناز پر

کیوں کھل پڑی تھی زلفِ پریشاں نہ پوچھئے
وقتِ فراق، کاکلِ برہم کی چھاؤں میں
افسردگیٔ چہرۂ تاباں نہ پوچھئے
وقتِ سفر چھڑی تھی جو اک لمحہ بیشتر
وہ داستانِ دیدۂ جاناں نہ پوچھئے
شرمندہ ہو نہ جائے کہیں رحمتِ خدا
اس بت کا التفاتِ فراواں نہ پوچھئے
ہیں اب بھی جوشؔ کو جو سہارا دیئے ہوئے
اس شوخ کے وہ عہد، وہ پیماں نہ پوچھئے

(نوحۂ فراق۔ حرف و حکایت ص ۱۰۰)

موت کے آغوش میں جینے کا ساماں کیا کروں
کیا کروں اے پیچ و تاب، شامِ ہجراں کیا کروں
اب نہ نقدِ عافیت باقی، نہ توقیرِ حیات
اب خیالِ دزد، خوفِ دشمنِ جاں کیا کروں
بھاگتی ہیں راحتیں مجھ سے جدھر جاتا ہوں میں
اے مذاقِ خدمتِ عمرِ گریزاں کیا کروں
دل سے تا ذراتِ دا انجم کوئی شے ساکن نہیں
کیا کروں اے گردشِ گردونِ گرداں کیا کروں
سر میں اک سودا سا ہے اور وہ بھی سودا عشق کا
دل میں اک خنجر سا ہے اور وہ بھی عریاں کیا کروں
ہو چکا ہے فکرِ ننگ و نام سے فارغ دماغ
اب یہ دامن کیا کروں اب یہ گریباں کیا کروں

امروزِ بے فردا (حرف وحکایات ص ۸۶)

ملیح آباد چھوڑ کر حیدرآباد میں وطن کی طرح مستقل رہے تھے۔ اب حیدرآباد چھوٹا تو نئے سرے سے گھر بنانا پڑا۔ جو باتیں ملیح آباد سے وابستہ تھیں ان سے دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ "قصرِ سحر" کا منہ اتر چکا تھا، خود اپنی زندگی نئے محور کے گرد چکر کھا رہی تھی، بچوں کو دیہات کی زندگی پسند نہ تھی، زمین داری کی حالت ایسی نہ تھی کہ اس سے پیٹ بھر سکے، اس لیے دھلی میں قیام کر کے جنوری ۱۹۳۶ء میں ماہنامہ "کلیم" جاری کیا اور دو مجموعے "نقش و نگار" اور "شعلہ و شبنم" شائع کیے۔ پہلے نظموں کو موضوع کے اعتبار سے ترتیب دے کر اور مختلف جلدوں میں شائع کرانے کا خیال تھا، چنانچہ اشتہار اسی طرح دیے گئے تھے لیکن بعد میں وہ ترتیب قائم نہ رہی۔ کلیم نے تھوڑے ہی دنوں میں اچھی خاصی مقبولیت حاصل کر لی، اس میں جوش نے نثر کے مضامین بھی لکھے[1] نثر "روحِ ادب" کے دور میں بھی لکھی تھی لیکن اس دور کی نثر میں صرف شاعری تھی، ادبِ لطیف لکھنے کی کوشش تھی اب ملکی اور ادبی مسائل، فلسفیانہ مباحث اور سماجی حقائق پر بھی نگاہ پڑ رہی تھی فطری جوش اور شدتِ احساس ان مضامین میں بھی نمایاں ہے، رنگینی ضرورت سے زیادہ ہے، استدلال پر جذباتی اندازِ نظر حاوی ہے لیکن اس میں زندگی کو سمجھنے سمجھانے اور بہتری کی جانب اشارہ کرنے کی کوشش کار فرما ہے۔

دھلی کے قیام میں جوش کو ہندوستان کے مقتدر سیاسی رہنماؤں سے

---

[1] ان مضامین میں اکثر کو یکجا کر کے نگارستان ایجنسی دہلی نے اشارات کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

ملنے کے مواقع ملے۔ دفتر شاہی نظام کو قریب سے دیکھنے اور آزمانے کا موقع نصیب ہوا۔ آزادی کی جد و جہد شدید سے شدید تر ہوتی جارہی تھی۔ نیا دستور ہندوستان پر عائد کیا جارہا تھا، انتہاپسند جماعتیں ابھر رہی تھیں، انجمن ترقی پسند مصنفین وجود میں آچکی تھی اور ادبی افق پر نئے ستارے طلوع ہو رہے تھے۔ جوشؔ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی شاعری کو ملک کی دوسری ترقی پذیر قوتوں سے ہم آہنگ کردینا چاہتے تھے، فرض اور محبت کی جنگ میں کبھی فرض کی جیت ہوتی تھی، کبھی محبت کی اور یوں جوشؔ کی شاعری کا کارواں طوفانوں سے کھیلتا، گلستانوں میں گلگشت کرتا، آندھیوں سے لڑتا، نسیمِ سحر کے جھونکوں میں ٹھہرتا آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔ نئی پود کے اکثر شعراء اُن سے متاثر تھے، انھیں "شاعرِ انقلاب" اور "شاعرِ اعظم" کہہ کر خطاب کیا جارہا تھا، عمر بھی پختہ کاری کی منزل میں تھی اس لیے خیالات میں زیادہ گہرائی نظر آتی ہے۔ عقل اور جنون کی کشمکش بڑھتی جارہی ہے، حقیقت افسانے سے دست و گریباں ہے۔ محبوبہ چونکہ دہلی میں تھی اس لیے ترانۂ بہار چھیڑتے ہیں تو یہ گیت گاتے ہیں ؎

پھر دامنِ صبا میں ہے مےخانہ آجکل
پھر ہر نفس ہے گردشِ پیمانہ آجکل
پھر عقل میں ہے عنصرِ وحشت کی خواہگی
پھر فقر میں ہے شوکتِ شاہانہ آجکل
پھر جوش پر ہے موسمِ برنائی جمال
پھر بار ھد پہ ہے عشوۂ ترکانہ آجکل
پھر فرش پر ہے جلوۂ افلاک ان دنوں
پھر عرش پر ہے نعرۂ مستانہ آجکل

پھر ہر غلامِ دہر ہے آقائے بحر و بر
پھر ہر کنیزِ شہر ہے سلطانہ آجکل
جس پر نثار کون و مکاں کی حقیقتیں
پھر کہہ رہا ہے جوشؔ وہ افسانہ آجکل

لیکن جب انھیں دنوں اِلّے تیمودؔ کو گداگری کرتے دیکھتے تو — "بھکارن شہزادی" کی سی نظم لکھتے تھے، لوگوں کو سرگرمِ عمل دیکھ کر اپنے فرض کا خیال بھی آتا تھا ۔

جب بلاتے ہیں فرائض دردناک آواز سے
سو رہا منہ پھیر لیتے ہیں حریمِ ناز سے
زندگی منہ دیکھنے لگتی ہے جب تلوار میں
روشنی رہتی نہیں محبوب کے رخسار میں ۱؎

لیکن جب عیش کی ترنگ بڑھتی تھی تو کہتے تھے —

میں نے کہ دنیا نئی معلوم کی ہے روح میں
دلفریب و دلنواز و دل فروز و دلنشیں
اس تڑپتے تلملاتے خاکدانِ غم سے دور
اک دہکتے جگمگاتے نجمِ پنہاں سے قریں

۱؎ یہ دو شعر کسی مجموعے میں نہیں ہے میں نے انھیں دنوں (یعنی ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء میں) تیج دہلی میں تین سطر "فرض اور محبت" کے عنوان سے پڑھے تھے وہ یاد رہ گئے۔

علتِ ایجادِ مرگ و زیست، جبر و اختیار
عقل کی اس بیوگی سے جس کو کچھ نسبت نہیں

خون کی گردش میں مضمر ہے جہاں ذکرِ حبیب
نبض کی جنبش میں غلطاں ہے جہاں "حبل المتین"

کون یہ در کھٹکھٹاتا ہے مرا؟ پوچھو کوئی؟
خیر ہو کیا اس طرف بھی آ گئے اہلِ زمیں؟

"آئے ہیں دنیا کے کچھ اوتار مجرے کو حضور"
"کہہ دو واپس جائیں ملنے کی مجھے فرصت نہیں"

(دل کی دنیا۔ حرف و حکایت ص ۱۴۳)

جوشؔ کی ذہنی کیفیات کی تصویر کشی ایک نظم سے نہیں پیش کی جا سکتی ان پر ایک وقت میں ایک جذبہ اتنی شدت سے طاری ہوتا ہے کہ جب تک وہ شعوری طور پر کوشش نہ کریں اس جذبہ کی پیچیدگی یا زندگی کی مجموعی کیفیت کو اس لمحہ میں نہیں دیکھتے۔ اِس زمانہ میں وہ دل کے پاس پاسبانِ عقل کو نہیں آنے دینا چاہتے۔ شاعر کی ہمہ گیر شخصیت ہر چیز کا جائزہ لیتی ہے لیکن ہر واقعہ اور ہر خیال کو اس کے تمام روابط اور تعلقات کی روشنی میں دیکھے بغیر صحیح فلسفیانہ نقطۂ نظر پیدا نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہ بھی حقیقت کا ایک تصور ہے کہ جو چیز جس وقت جیسی معلوم ہوتی ہے اُسی طرح پیش کر دی جائے لیکن حقیقت کا حکیمانہ تصور یہ ہے کہ اس کی مجموعی حیثیت کو سامنے رکھ کر نتیجہ نکالا جائے۔ اس زمانے میں جوشؔ اپنے مشاہدہ اور مطالعہ کے بھروسے پر باریک سے باریک نقوش بنا سکتے تھے اور اس کو فخر کے ساتھ محسوس کرتے تھے۔

کبھی دل تخسر سے دیتا ہے آواز
کہ اک تنکے سے ہلکا آسماں ہے
کبھی فریاد کرتا ہے کہ مجھ پر
نفس کا تقل بھی کوہِ گراں ہے
کبھی ہر ذرّہ خاکی کا محکوم
کبھی شمس و قمر پر حکمراں ہے
کبھی ہے کامراں ہو کر بھی ناکام
کبھی ناکام ہو کر کامراں ہے
کبھی لطفِ خداوندی سے مغموم
کبھی جورِ بتاں سے کامراں ہے
کبھی مژگاں کی جنبش سے کہن سال
کبھی صدیوں کی کاوش سے جواں ہے
سُن اے غافل! کہ جس دل کے ہیں یہ طور
وہ دل ہم شاعروں کا آشیاں ہے
دماغوں پر کھلیں ہم کیا کہ ہم کو
وہ سمجھے گا جو دل کا رازداں ہے

شاعر کا دل (فکر و نشاط ص ۴۲)

لیکن ضرورت اور وقت کا احساس کچھ اور مطالبہ کرتے ہیں۔ ہر صاحبِ شعور کو اپنے تصورات میں یک رنگی، ہم آہنگی اور منطقی تسلسل پیدا کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ وہ اپنے خیالات سے دوسرے دل کو متاثر کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جوش اپنی مزاجی انفرادیت کے باوجود کوشش کرتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں "انجمن ترقی پسند مصنفین کے

ہندوستانی تہذیب کی ایک کانفرنس الٰہ آباد میں منعقد ہوئی۔ مجلس صدارت میں جوشؔ بھی تھے۔ خطبۂ صدارت میں انھوں نے تفکر اور تدبر کی اہمیت پر زور دیا اگرچہ اس خطبہ میں ان کے عقیدۂ جبر نے انھیں بہت سی ایسی باتیں کہنے پر "مجبور" کیا جو بیشتر متضاد اور رسمی ہیں اس کا تجزیہ کہیں اور ہوگا یہاں صرف اتنا ہی تذکرہ مقصود ہے جس سے اُن کے ذہنی ارتقار کا کوئی پیچ کھلے۔ اس خطبے میں وہ مکمل انقلاب کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ ان کا خیال ہے کہ ہر طرف انقلاب کے آثار ہیں مگر ہندوستانی انھیں دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے:

"خدارا بتاؤ کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ سینۂ ہندوستان میں انقلاب کا جو سُرخ شعلہ آہستہ آہستہ تھرتھرا رہا ہے اُسے ہوا دینا شروع کر دیا جائے؟ انقلاب! انقلاب! ہر شے میں انقلاب؟ زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب، آداب و رسوم میں انقلاب، نظریات و معتقدات میں انقلاب، مسلّمات و کلّیات میں انقلاب، سیاسیات و مذہبیات میں انقلاب، یکسر انقلاب، تمام تر انقلاب اور مکمل انقلاب!"

اشارات (جوشؔ) ص ۶۳

انھیں احساس ہو رہا تھا کہ

"اس وقت ہندوستانی زندگی کی ضرورتیں جان و دل ہی کی قربانی کے لیے مچلی ہوئی ہیں"

وہ کہہ رہے تھے :

"میں سردست اپنی قوم میں یہ دیکھنا
نہیں چاہتا کہ دل دماغ پر غلبہ حاصل
کیے رہے۔"

کیوں کہ بھوک، بے زری، بے روزگاری، بیماری اور جہالت ایسی حقیقتیں ہیں جن سے آنکھیں نہیں چرائی جاسکتیں۔ اسی خطبۂ صدارت میں لکھتے ہیں :

"میں ایک مدت سے سنتا چلا آرہا ہوں
کہ ہر قوم کے ادیب اور شاعر انتہا درجے کے
حساس، خوددار، اور غیور ہوا کرتے ہیں۔ اگر
میرے ہندوستان میں بھی یہی ہے تو میں
اپنے شاعروں اور ادیبوں کے سامنے دوزانو
ہو کر گڑگڑاؤں گا کہ خدارا اپنے ادب میں عظیم
انقلاب پیدا کر کے ہند کی ڈوبتی ہوئی کشتی
کو خونی گرداب کے خون آشام دانتوں سے
چھڑا لیجیے، ورنہ کشتی ڈوب جائے گی اور
شباب و محبت کا واسطہ اپنے ادبیات
میں حیات بیداری کا خون دوڑائیے اور
وطنِ عزیز کے لیے دلوں کی طرح دھڑکتے
ہوئے زندہ الفاظ کو جوڑ کر ایک نیا باب الہند
تیار کیجیے جس کی سنہری اور بلند محراب کے نیچے
سے زندہ کر دینے والے انقلابات کے نقرئی
جلوس فوج در فوج اور قطار اندر قطار

ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہو جائیں
یاد رکھیے ایک صحیح جنبشِ قلم ستر ہزار
برہنہ تلواروں کے مقابلہ میں زیادہ کارآمد
آلۂ جنگ ہے"

اشارات (جوش) ص ۶۸

یوں انفرادی خواہشوں اور حقیقتوں میں جنگ جاری رہی، ایسا لگتا ہے کہ جوش اسے ٹھیک سے حل کرنا بھی نہیں چاہتے تھے، اس کشمکش میں لذت لیتے ہوئے، کبھی احساس کی شدت اور کبھی بے حسی کی دعا کرتے، کبھی علم کی پیاس اور کبھی معصوم جہالتوں کی تمنا کرتے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ اس دور میں جوش نے رباعیاں بھی بڑی تعداد میں لکھی ہیں، بڑی نادر اور خوبصورت، بڑی رنگین اور بصیرت افروز، ان میں شاعر کی روح کی کشمکش نمایاں ہے۔ حقائق کی جستجو کا سلسلہ جاری ہے، جبر کی حکومت ہے اور آزادی اور عمل کی خواہش، شراب "مایہ تربیت روح رواں" بن چکی ہے اس زمانے میں جوش کے دو اور مجموعے فکر و نشاط اور جنون و حکمت شائع ہوئے۔ آخر الذکر میں صرف رباعیاں ہیں۔

جوش، دہلی، بمبئی، دھولپور، لکھنؤ اور ملیح آباد میں رہتے تھے دہلی میں مرکز اور مستقر تھا۔ کلیم کا خیر مقدم ملک میں بہت شاندار ہوا تھا لیکن جوش اسے تاجرانہ حیثیت سے چلانے میں ناکام رہے خرچ آمدنی سے زیادہ تھا اور دہلی میں قیام ناممکن تھا اس لیے پھر ملیح آباد کا رخ کیا۔ چنانچہ کلیم کو لیے ہوئے ۱۹۳۹ء میں ملیح آباد چلے آئے۔

جون ۱۹۳۸ء میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا تھا۔ جس کا تذکرہ کئی حیثیتوں سے ضروری ہے۔ جوشؔ بمبئی میں ہیں۔ کئی عزیز اور دوست ساتھ ہیں، محبوبہ بھی ہمراہ ہے، اندھیرا ہو چکا ہے۔ اپالو کی سیر ہو رہی ہے تند و تیز ہوائیں چل رہی ہیں، سمندر کی لہریں ساحل پر چڑھتی ہوئی چلی آ رہی ہیں اور تماشائیوں کا ہجوم ابر و باد کی وجہ سے چھٹ رہا ہے۔ جوشؔ اور ان کے ساتھی بھی واپس آنے کے لیے مڑتے ہیں۔ محبوبہ کی زندگی شدید کشمکش کی زندگی ہے وہ سب سے پیچھے رہ جاتی ہے اور جیسے لوگوں کی پیٹھ ادھر سے پھرتی ہے وہ خودکشی کی نیت سے اپنے کو سمندر میں گرا دیتی ہے۔ جوشؔ نے مڑ کر دیکھا تو وہ موجوں کی پیچ و تاب میں آخری دفعہ ہاتھ پیر مار رہی تھی وہ خود بھی پیرنا نہیں جانتے لیکن ایک لمحہ کے اندر وہ بھی سمندر میں کود پڑے اور انھیں خود خبر نہیں کہ کس طرح انھوں نے محبوبہ کو بچا لیا۔ اس حادثے کو یاد رکھنے کے لیے جوشؔ نے کئی نظمیں لکھیں جن میں سے .... تین نظمیں "تو اگر واپس نہ آتی"، "نیا امرت"، "فاتحِ بحر کی خدمت میں"، ان کے مجموعے آیاتِ و نغمات میں شامل ہیں۔ تینوں نظمیں غیر معمولی شدتِ احساس اور رنگینی کی حامل ہیں ان نظموں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جوش سمندر میں اس لیے کود پڑے تھے کہ یا تو محبوبہ کو بچا لیں گے یا پھر خود بھی دامنِ آب میں سو رہیں گے

۵

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بطونِ خاک سے
ہاتھ آ جاتا اگر تیرا نہ میرے ہات میں
دل پہ کیا کچھ بیت جاتی اس اندھیری رات میں

اف وہ طوفاں، وہ بھیانک تیرگی، وہ ابر و باد
وہ ہوائے تند باراں، وہ خروشِ برق و رعد
دفعتاً وہ روشنی کے سلسلے کا ٹوٹنا
وہ گھٹاؤں کی گرج سے نبضِ ساحل چھوٹنا
وہ اپالو کے کلیجے کی مچلتی "مان سُون"
وہ سمندر کے تھپیڑے، وہ ہواؤں کا جنون
اور اس طوفان میں اے زندگی کی روشنی
کود پڑنا وہ سمندر میں ترا یک بار گی

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بطونِ خاک سے
اس دلِ سوزاں میں آتے اس بلا کے زلزلے
آسماں روتا، زمیں ہلتی، ستارے کانپتے
موت اور پھر موت تیری، الحفیظ والاماں
ہڈیوں سے آنچ اٹھتی اور بالوں سے دھواں
لیکن اک لمحے کے بعد اے پیکرِ حسن و حیات
جوشؔ کو بھی کاوشِ ہستی سے مل جاتی نجات
پہلے ہوتا اک تلاطم، ایک طوفاں، ایک جوش
بعد ازاں تو اور میں، اور بحر و باراں کا خروش
انفصالِ روح ہوتا موت کے گرداب میں
آتشِ غم سرد ہو جاتی کنارِ آب میں

بحر کے سینے کو جب طوفان میں لاتی ہوا

پے بہ پے آتی ہمارے گنگنانے کی صدا
جب گھٹائیں رقص کرتیں اور پپیہے کوکتے
نور میں لپٹے ہوئے دونوں ابھرتے بحر سے
رات جب کچھ بھیگ جاتی اور جھک جاتا قمر
سیر کرتے روز ہم باہیں گلوں میں ڈال کر
چھیڑتا جب کوئی ساحل پر ہماری داستاں
پڑنے لگتیں بحر پر دھندلی سی دو پرچھائیاں
زندہ رہتے حشر تک غم کے پرستاروں میں ہم
سانس لیتے سازِ حسن و عشق کے تاروں میں ہم
وقف ہو جاتے محبت کے فسانے کے لیے
سرد ہو کر آگ بن جاتے زمانے کے لیے
تو اگر واپس نہ آتی (آیات و نغمات ص ۵۹)

کامیاب محبت کے انتہائی نقطۂ عروج پر پہونچکر موت کی خواہش احساس محبت کا گرانقدر عطیہ ہے یہ محض تخیل پرستی یا رومانیت نہیں ہے بلکہ عالم وصال میں ابدی زندگی پالینے، زندۂ جاوید بن جانے کی آرزو کی مظہر ہے۔ یہ نظم جوشؔ کے کردار کے جذباتی پہلو پر اتنی تیز روشنی ڈالتی ہے جس کو واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔

جوشؔ ملیح آباد میں رہنے لگے، قدیم صحبتیں برہم ہو چکی تھیں، پرانی زندگی الوداع کہہ چکی تھی شعر و شاعری اور مطالعہ میں وقت صرف ہوتا تھا۔ چند قدموں کے فاصلہ پر لکھنؤ تھا جس کی گلیاں دل میں بسی ہوئی تھیں۔ کلیم بند کر چکے تھے نظموں کا ایک اور مجموعہ "حرف و حکایت" شائع کیا تھا، حیدرآباد کی پنشن، پٹیالہ سے ایک وظیفہ، کتابوں کی آمدنی اور تھوڑی بہت زمینداری

جس کی حالت ابتر تھی، یہ آمدنی کے ذرائع تھے، زندگی کچھ خاموش سی تھی کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ جوش کی سیاسی شاعری سامراج دشمنی اور انگریز دشمنی کے جذبات سے مملو تھی بسنہ ۱۹۳۶ء میں وہ ایک طنزیہ نظم "وفاداران ازلی کا پیام شہنشاہِ ہند کے نام" لکھ چکے تھے اس درمیان میں انگریزوں نے ہندوستانیوں کے آزادی کے مطالبات کو بار بار ٹھکرایا تھا ایک ایسا دستورِ اساسی ان پر مسلط کیا تھا جسے ملک کی ہر سیاسی جماعت نے ناپسند کیا تھا۔ اب جو جنگ شروع ہوئی تو جذباتی ہندوستانیوں کو فطری طور پر خوشی ہوئی کہ انگریز مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ شہنشاہیتیں خوفناک اژدھوں کی گتھ گئیں۔ انگریز نے اپنے غلام ہندوستان سے بھی میدان میں اترنے کو کہا۔ جوش نے یو۔پی کے گورنر سرہارس ہیلٹ کی وہ اپیل پڑھی جس میں یو۔پی کے باشندوں سے جنگ میں جان ومال سے مدد کرنے کی خواہش ظاہر کی گئی تھی اور یہ کہا گیا تھا کہ ہٹلر نے اپنے درندوں کو ابھار دیا ہے کہ وہ دنیا سے تہذیب اور نظام عدل کا خاتمہ کردیں، ان خونخوار درندوں کو روکنے کی کوشش ہر شخص کا انسانی فریضہ ہے۔ جوش کے سامراج دشمن اور قومی جذبات کو ایسی چوٹ لگی کہ انھوں نے چند لمحوں کے اندر اپنی مشہور نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے۔[۱]" لکھ ڈالی جو شائع ہو کر ضبط ہوگئی۔

---

[۱] جوش نے یہ نظم ملیح آباد میں لکھی اور دوسرے روز لکھنؤ آئے۔ سب سے پہلے راقم الحروف کے غریب خانہ پر تشریف لائے اور کہا "دس منٹ میں ایک نظم لکھی ہے سُن لو" میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔ پوری نظم سنائی۔ کچھ جنگ کے متعلق باتیں کیں جانے لگے تو میں نے کہا "یہ بھلا شائع کہاں ہو سکے گی، ایک نقل میں رکھ لوں" یہ کاغذ مجھے دیدیا۔ اس طرح لکھی ہوئی تھی کہ میں نے جوش کی مدد سے اسے نقل کیا۔ میرے یہاں سے "نیا ادب" کے دفتر میں پہونچے۔ سردار جعفری نے وہ نظم لے کر (باقی آگے)

کچھ دنوں کے بعد جوش نے لکھنؤ ہی میں مستقل قیام اختیار کیا۔ اپنی طویل نظم "حرفِ آخر" کا خاکہ ملیح آباد ہی میں بنا چکے تھے۔ کچھ اشعار لکھ بھی لیے تھے اور اس کے مکمل کرنے میں ایسا انہماک تھا گویا پانچ چھ ہزار اشعار کی نظم تھوڑے ہی دنوں میں ختم کرلیں گے۔ کبھی کبھی رومانی نظمیں اور رباعیاں بھی لکھتے تھے۔ اپنے پروگرام (پروگرام۔ نقش ونگار) کے مطابق زندگی بسر کر رہے تھے۔ ادبی جلسوں اور صحبتوں میں بھی شریک ہوتے — رندانہ محفلوں میں بھی، عزیزوں اور دوستوں کے یہاں بھی جاتے اور شہر سے باہر بھی۔ شام ہوتے ہی "پیمانہ بکف طلوع" ہو جاتے مختلف مقامات پر "نشستیں" ہوتیں۔ وہاں مخصوص احباب ہوتے اور کبھی شعروشاعری میں، کبھی باتوں میں وقت کٹتا۔ ان صحبتوں میں زیادہ تر جوش کے پرستار ہوتے تھے جو کبھی کبھی امرا کے دربار کی کیفیت پیدا کر دیتے تھے۔ گفتگو انداز گفتگو، لطائف وظرائف، نشست وبرخاست کی یکسانیت کبھی کبھی ان لوگوں کو اکتا بھی دیتی تھی جو محفل میں شریک ہو کر باہوش تماشائی بھی بن سکتے تھے۔

حرفِ آخر کے لیے جوش نے مطالعہ کی رفتار اور نوعیت تبدیل کر دی تھی، مذہب، فلسفہ اور سائنس کی کتابیں خاص طور سے پڑھ رہے تھے۔ عقیدہ جبر کی روشنی میں نظمیں ہی نہیں لکھ رہے تھے بلکہ اس

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) "نیا ادب" میں چھاپ دی۔ بعد میں وہ نمبر ضبط ہوگیا۔ پھر سے "آزادی نظمیں" نامی مجموعہ میں نقل کیا گیا۔ وہ کتاب بھی ضبط ہوگئی۔ یہ نظم جوش کے کسی مجموعہ میں نہیں ہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد جوش کے یہاں تلاشی ہوئی۔ تلاشی پر ایک نظم لکھی وہ بھی کسی مجموعے میں نہیں ہے انھیں دنوں کسی نے "ہٹلر اعظم سے خطاب" کے عنوان سے ایک نظم لکھی جو جوش سے منسوب کی گئی۔ وہ نظم جوش کی نہیں ہے۔

کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔ جنگ نے ایک نئی کروٹ لی تھی۔ جرمنی نے روس پر حملہ کر کے لڑائی کی شکل بدل دی تھی۔ دنیا کے ترقی پسندوں، جمہوریت پرستوں اور آزادی کے ہواخواہوں میں ایک بڑا طبقہ ایسا تھا جس کے خیال میں اب جنگ سامراجی طاقتوں کے درمیان نہ تھی بلکہ ترقی اور رجعت کی قدریں ایک دوسرے سے برسرپیکار تھیں۔ ایک طرف سوویت روس، انگلستان، چین، امریکہ، اور ان کے تمام مفتوحہ قوموں کی رُوحیں تھیں جنھیں ہٹلر اپنے قدموں کے نیچے دبائے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا دوسری طرف جرمنی، اٹلی، جاپان اور مفتوحہ ممالک کے زرخرید غلام تھے۔ یہ ایسی شدید کشمکش تھی جس میں تخیل پرست اور جذباتی انسان کے لیے کوئی فیصلہ کرنا آسان نہ تھا۔ جوشؔ کی انگریز دشمنی اتنی شدید تھی کہ وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہونچ سکے۔ جاپان نے بھی اپنا خونیں کھیل شروع کر دیا تھا، ملایا، برما، انڈوچائنا، انڈونیشیا سب فتح ہو چکے تھے۔ اب جاپانی فوجیں ہندوستان میں داخل ہونا چاہتی تھیں، جوشؔ جاپان کی اس فوجی فاشزم سے متنفر تھے لیکن چونکہ جاپان انگریزوں کا دشمن تھا اس لیے جوشؔ پھر خاموش رہے یہاں تک کہ اگست ۱۹۴۲ء میں انگریزی سامراج نے ہندوستان پر بھرپور وار کر دیا۔ جب ہندوستان کے سیاسی رہنما اختلافات کے باوجود حالات کی رفتار اور واقعات کے دباؤ کو پیشِ نظر رکھ کر انگریزوں سے قومی حکومت کا مطالبہ کر رہے تھے اور آزادی کا اعلان چاہتے تھے تاکہ وہ ہندوستانیوں کو کوئی حیثیت القوم جنگ میں شریک کر کے جاپان کا مقابلہ کر سکیں انگریزی حکومت نے انھیں خوف زدہ کرنے کے لیے جیلوں میں بند کر دیا۔ عوام غصے سے اندھے ہو گئے، ان میں فاشزم سے نفرت کا جو جذبہ پیدا ہوا تھا وہ پھر پیچھے ہٹ گیا اور انھوں نے اپنے خالی ہاتھوں سے انگریزی

حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہا۔ انگریزی حکومت نے انقلابیوں پر وہ ظلم کئے جن کو تاریخ کبھی نہ بھولے گی۔ سماجی، تاریخی اور سیاسی مسائل میں قوتِ فیصلہ کے لئے اس سے اہم آزمائش کے مواقع کم آئے ہوں گے۔ ایک شاعر کی روح جو ہر چیز سے روشنی حاصل کرنے کی متمنی تھی اس پیچیدگی میں راستہ تلاش نہ کرسکی، جوش بھی گونگے بن گئے اور جنونِ حکمت کی پرانی آویزشیں جو ہزارہا بار دل کے تاروں کو چھیڑ چکی تھی پھر دل میں جاگزیں ہوگئی۔ اس زمانے میں جوش نے کئی نظمیں ایسی لکھی ہیں جو تذبذب کا پتہ دیتی ہیں۔ کبھی مایوسی ہے کبھی امید، کبھی تاریکی ہے کبھی روشنی، کبھی فلسفی بن کر درسِ حکمت دینے کا شوق ہے، کبھی رند بن کر سب کچھ جام و سبو میں غرق کردینے کا حوصلہ۔ کبھی انسان ظالم اور جاہل نظر آتا ہے کبھی فاتحِ کائنات دکھائی دیتا ہے۔ اس زمانے کی اہم نظمیں نظامِ نو، آدمی نامہ، لاعلاج تاخیر، ششدر، دہیج ہیں۔ ان نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر غیر معمولی ذہنی کرب میں مبتلا ہے لیکن اُسے ناقابلِ شکست یقین ہے کہ زندگی رو بہ ترقی ہے، ایک بہتر دور آئے گا اور انسان قدرت کا غلام نہ رہے گا بلکہ آقا بن جائے گا۔ جبر کے ساتھ یہ امید میل نہیں کھاتی لیکن اس کا تجزیہ کہیں اور ہوگا ہنر زندگی۔ متر مادی زندگی کا تصور —— ارتقا کے جس عقیدے پر مبنی ہے جوش نے اس زمانے میں اس کا مطالعہ خاص طور پر کیا تھا ۔

انسان وہ گلی ہے جو اب تک کھلی نہیں
وہ شاخ ہے ہوا سے جو اب تک ہلی نہیں
پوشاک ہے یہ وہ جو ابھی تک سلی نہیں
کنجی ہنوز عقل کی اس کو ملی نہیں

—— جو آج تک ہے بند وہ تالا ہے آدمی

اب تک ہے بزمِ جہل میں ناداں ڈٹا ہوا
اب تک ہے علم و عقل و ہنر میں ڈٹا ہوا
اب تک لباسِ ذہن و ذکا ہے پھٹا ہوا
اب تک ہے خاکِ تیرہ میں انساں اٹا ہوا

پرواکسے جو آج ہے دن بھی سیاہ رات ۔۔۔ کیا غم اگر زمیں پہ وہ آئے دیر ممات

یعنی بہ حکمِ دہر وبہ فرمانِ کائنات ۔۔۔ انساں کو آج روند رہے ہیں جو حادثات

کل ان کو جوش روندنے والا ہے آدمی

(آدمی نامہ ۔ عرش و فرش ص ۵۱)

کھیل ہاں اے نوعِ انساں ان سیہ راتوں سے کھیل

آج اگر تو ظلمتوں میں پابہ جولاں ہے تو کیا

مسکرانے کے لیے بے چین ہے صبحِ وطن

اور چندے ظلمتِ شامِ غریباں ہے تو کیا

مٹھیوں میں بھر کے افشاں چل چکا ہے انقلاب

ابرِ غم زلفِ جہاں پر بالِ جنباں ہے تو کیا

(نظامِ نو ۔ عرش و فرش ص ۵)

انھیں دنوں جوش شمالی مارکیٹس لونا میں شامل ہو گئے ۔ پونا اور بمبئی کے قیام میں جوش کو ہندوستانی سیاست پر نئے سرے سے غور کرنے کا موقع ملا ۔ ہندوستان کے زیادہ تر رہنما جیلوں میں بند تھے، جو باہر تھے وہ بے دلی سے فاشزم کو رجعت پسند تحریک بتا رہے تھے، صرف کچھ ترقی پسند فاشزم اور سامراج دونوں کے گلے گھونٹ دینے کی تدبیر بتا رہے تھے اور ہندوستانی سیاست کی گتھیوں کو بین الاقوامی حالات کے پس منظر میں حل کرنے میں کوشاں تھے ۔ جوش نے بھی اس نقطۂ نظر کو تسلیم کیا اور جب مئی ۱۹۴۳ء میں بمبئی کی "انجمن ترقی پسند مصنفین کانفرنس" میں شریک ہوئے تو تذبذب قریب قریب دور ہو چکا تھا ۔ انھوں نے رسالۂ نظامی کے ساتھ، جو بیان دیا وہ ان کے خیالات کی واضح تصویر ہے ۔ اس

بیان میں جوشؔ نے واضح طور پر ہندوستان کے لیے ایک اشتراکی نظام کا خیال ظاہر کیا ہے، ہندو مسلم اتحاد، قومی حکومت، آزادی، ناشزم کا استیصال اور نئے ہندوستان کی بیان اس بیان کے مرکزی خیالات یہ ہیں:

"ہمارے نزدیک ان حالات میں ملک کے تمام ادیبوں کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام ہندوستانی قوم کو موجودہ خطرات سے آگاہ کریں، انھیں اتحاد کے لیے اٹھائیں۔ اگر ہم متحد ہوتے ہیں تو کامیابی کا سہرا ہمارے سر رہے گا اور وہ عروسِ آزادی جس کا ہم صدیوں سے خواب دیکھ رہے ہیں ہمیں حاصل ہو جائے گی اور ہم دنیا کی متحدہ اقوام کے ساتھ ایک آزاد حیثیت سے اس نئی دنیا کی تعمیر میں حصّہ لے سکیں گے جو فسطائی بربریت کی شکست اور سامراج کی بیخ کنی کے بعد معرضِ وجود میں آئے گی۔"

ایشیا (پونا) مئی جون ۱۹۴۳ء

اشتراکی فلسفہ ہندوستان کی سرزمین میں جڑ پکڑتا جاتا تھا اس لیے سارے رجعت پسند شعوری یا غیر شعوری طور پر اس طوفان کو روکنے کی تدبیروں میں لگ گئے، یہ روشنی بمبئی سے پھوٹ رہی تھی اس لیے وہیں اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ کچھ لوگوں نے انجمن "اصلاحِ ادب" قائم کرکے ترقی پسندی کی مخالفت میں، ۷ اگست ۱۹۴۳ء کو ایک جلسہ کیا جس میں بزعمِ خود ترقی پسندوں کے گمراہ کن ادبی رجحانات سے بیزاری کا اعلان کیا گیا۔ جوشؔ ادبی تحریکات

کی بنیادوں سے اس قدر واقف ہو چکے تھے کہ انھوں نے فوراً اس کانفرنس کی تجاویز کا تجزیہ کیا اور ایک دلچسپ طویل مضمون "ادب اور احتساب" کے عنوان سے لکھا جو مختلف رسائل میں شائع ہوا۔ یہ مضمون جوش کے ذہنی ارتقار کی ایک خاص منزل کا نشان بردار ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ایک وکیل کی طرح ترقی پسند ادب کی حمایت کی۔ رجعت پسندی کسی بھیس میں ہو، جوش اس زمانے میں اس کی مخالفت ضرور کرتے تھے، ہاں جہاں اُن کا شعور ان کی خیال پرستی کا پورا ساتھ نہیں دیتا تھا وہاں وہ عقیدے کی گود میں گر جاتے تھے۔

اس زمانے میں جوش اچھے بُرے فلمی گیت لکھ رہے تھے، نظمیں کم رباعیاں زیادہ لکھتے تھے۔ ایک نئی الجھن یہ پیدا ہو گئی تھی کہ جوش کی ناتھالی جاگیر، ان کے ماموں کے لاولد انتقال کر جانے کی وجہ سے لاوارث پڑی تھی۔ جوش کے بہتر دوں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہی ان کے وارث ہو سکتے ہیں چنانچہ جوش کچھ دنوں تک دھرلپور بھی آتے جاتے رہے لیکن اس مہم میں انھیں کامیابی نہ ہوئی، اس کے اثرات ان کی بعض رباعیوں (سنبل وسلاسل ص ۲۵۶) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ انتشار کی اثرات ویسے تو جوش کی نہ جانے کتنی نظموں میں نمایاں ہیں لیکن اسی سال یعنی ۱۹۴۴ء میں جوش نے کارل مارکس کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا۔

السلام اے مارکس، اے دانائے راز

اے مریضِ انسانیت کے چارہ ساز

نخلِ خوشحالی کی بیخ و بُن ہے تو

عقدہ ہائے زیست کا حاصل ہے تُو

مانتیں قومیں اگر تیرا انتظام

آج تلواریں نہ ہوتیں بے نیام

دشمنِ پیمانۂ پست و بلند
حامیِ بیچارگانِ دردمند
منکرِ دارائیِ عرشِ بریں
اولیں پیغمبرِ فرشِ بریں
ہند را آتش بہ جائے دادہٗ
پائے شل را ہم خرامے دادہٗ
(کارل مارکس۔ عرش و فرش ص ۱۵۰)

۱۹۴۵ء کے وسط میں دوسری جنگِ عظیم ختم ہوئی اور ان مصیبتوں کا آغاز ہوا جو جنگ کی جلوہ میں آتی ہیں یعنی اقتصادی اور معاشی بحران اور مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ۔ لیکن بہرحال جنگ کے خاتمہ نے یہ تو سوچنے کا موقع دیا کہ آئندہ انسانی مفاد کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے! سان فرانسسکو کانفرنس میں اقوامِ متحدہ نے آنے والی دنیا کا خاکہ تیار کرنا شروع کیا۔ غلام ہندوستان کے نمائندوں نے بھی شرکت کی لیکن یہ ہندوستان کے نمائندے نہیں حکومتِ برطانیہ کے نمائندے تھے۔ جوشؔ نے بھی اسے محسوس کیا اور چھوٹی سی طنزیہ نظم لکھی ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ بین الاقوامی مسئلہ بن چکا تھا اس لیے انگلستان میں جیسے ہی لیبر حکومت برسرِ اقتدار آئی اسے اس مسئلہ کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ انگریزی سامراج نے ۱۸۵۸ء سے دوسری جنگِ عظیم تک کی مدت میں ہندوستان کی اور اصلاحات کے متعلق بہت سے وعدے کیے تھے اس لیے عام طور پر اس کی کسی پیشکش کو سنجیدہ حلقوں میں اہمیت نہیں دی جاتی۔ ہر وعدے میں کوئی سیاسی پیچ مضمر ہوتا تھا۔ کوئی ایسا پہلو ہوتا تھا جس سے فرقہ وارانہ تعلقات خراب ہوں اور ترقی کی قوتوں پر چوٹ پڑے لیکن لڑائی نے بین الاقوامی

حالات بدل دیئے تھے۔ اور لیبر گورنمنٹ کو اپنی "کیبنٹ" کے تین ممبر ہندوستان بھیجنے پڑے۔ ان کی طویل گفت وشنید اور پرانے تجربات کی بنا پر لوگوں نے یہی فیصلہ کیا کہ یہ وقت گزاری ہے چنانچہ جوش نے بھی ان کے جال سے بچنے کی تلقین کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کی کشیدگی انتہا کو پہونچ چکی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ دونوں جماعتیں کسی بات پر متحد نہ ہوں گی، ہر سوال ہندو مسلم مناقشہ کی شکل اختیار کر رہا تھا، یہ تو معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ہو کر رہے گا، لیکن مستقبل کا خاکہ واضح نہ تھا۔ زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش ہو رہی تھی لیکن سانچہ تیار نہیں ہو رہا تھا۔ تہذیبی مذہبی، لسانی، سیاسی، اقتصادی کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو عقائد، سیاسی سوجھ بوجھ، رواداری کا مطالبہ کرتا ہو اور ان میں سے کسی پہلو کو جذبات سے الگ ہو کر حل کرنے کی کوشش نہ ہندو رہنما کر رہے تھے نہ مسلمان۔ لیکن جوش ایک شاعر رہنما کی حیثیت سے اتحاد، یک جہتی، رواداری کی تلقین کر رہے تھے۔

اٹھ اے ندیم کہ رنگِ جہاں بدل ڈالیں
زمیں کو تازہ کریں، آسماں بدل ڈالیں

نظامِ وحدتِ اقوام کا ہے یہ منشور
کہ بہ تصورِ سود و زیاں بدل ڈالیں

یہ ولولہ ہے تو آست سے بہتر اے دوست
مزاجِ طفلکِ ہندوستاں بدل ڈالیں

——— اٹھ اے ندیم۔ (رامش ونگ ص ۸)

نوخیزانِ کمیونسٹ پارٹی سے کہہ رہے تھے ؎
غرق ہو جائے گی شیخ و برہمن کی برہمی
جوئے امواجِ اخوت کو رواں ہونے تو دو

تم نے کاوش سے بنایا ہے جو یہ کوہِ گراں
اک نفس ٹھہرو اسے آتش فشاں ہونے تو دو

"لیلائے آزادی" کو دلہن بنا کر یوں پیش کیا تھا:

گوش بر آواز ہیں نو واردانِ انجمن
زحمتِ یک حرفِ تازہ اے لبِ شیریں سخن
اذنِ تبلیغِ محبت دے نگاہِ ناز کو
گامزن ہیں جادۂ نفرت پہ شیخ و برہمن
دستخط کر دے جدید آئین کے فرمان پر
یہ ہے قرطاس و قلم اے ناسخِ شرعِ کہن
ٹوٹ جائے سبحہ و زنار کا بندِ گراں
کھول دے ہاں دوش پر زلفِ شکن اندر شکن

(لیلائے آزادی سے سنبل و سلاسل ص ۱۲۶)

۱۹۴۵ء کے آخر میں جوش نے ایک نظم "وقت کی آواز" لکھی جو ان کے اس وقت کے خیالات کا پتہ دیتی ہے۔ بہت سے محبانِ وطن کا خیال تھا کہ ہندو مسلم مل کر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کریں گے لیکن بدقسمتی سے لیگ اور کانگریس کے رہنما "کیبنٹ مشن" ہی سے آس لگائے بیٹھے تھے۔ اپنی نظم "تثلیثی فریب" میں جوش نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ اس زمانے میں جوش نے زیادہ تر رباعیاں لکھی ہیں جن میں اپنے خیال میں وہ حیات کی عقدہ کشائی کر رہے تھے لیکن ان میں صرف فلسفیانہ اشارے ہیں جن میں کوئی مخصوص ترتیب اور نظم نہیں ہے۔ بس جہاں آزادی اور بہتر مستقبل کا سوال آتا ہے وہاں جوش کے خیالات میں دبی ابتدائی گرمی اور امید نظر آجاتی ہے۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں

"مستقبل ہندوستان کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں جوش کی فکری روایت اور اس کے تسلسل کا پتہ چلتا ہے ۔

کچھ ایسا آج گردوں کا سماں معلوم ہوتا ہے
کہ عکسِ آتشِ رطلِ گراں معلوم ہوتا ہے
یہ کس نے چونک کر انگڑائی لی ہے آسمانوں پر
زمیں کا ذرہ ذرہ پرفشاں معلوم ہوتا ہے
اٹھایا ہے یہ کس نے چھٹ پٹے کا طرفہ آئینہ
تبسم کار دل درکارواں معلوم ہوتا ہے
الحمد اللہ کہ جوش اس صبحِ نو کی تازہ کاری میں
مجھے مستقبلِ ہندوستاں معلوم ہوتا ہے۔

مستقبل ہندوستان (سنبل وسلاسل)

یوں جوش ہندوستان کے مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوئے لیکن وہ ہندوستانی رہناؤں کے رویّہ کی برابر تنقید کرتے اور انھیں گویا یہ بتاتے رہے کہ ہندوستان کا مستقبل اتحاد ہی کے ہاتھوں سنور سکتا ہے۔ بخشی ہوئی نہیں چھینی ہوئی آزادی حقیقی آزادی کہی جاسکتی ہے اسی لیے جب انگریزی سامراج کی بخشی ہوئی عارضی "قومی حکومت" نے حلفِ وفاداری اٹھایا تو جوش کی روح زخمی ہوگئی۔ جن لوگوں نے انگریزی حکومت کا تختہ الٹ دینے کی قسم کھائی تھی وہی انگریزی حکومت سے وفادار رہنے کی قسم کھارہے تھے۔ اس کی سیاسی نوعیت کیا تھی ، اس مفاہمت کا کیا مقصد تھا۔ جوش کو اس سے سروکار نہیں وہ تو یہ دیکھ رہے تھے کہ رہناؤں کا کردار بدل گیا ہے باغی وفادار بن رہے ہیں، تاج و تخت کو ٹھکرانے والے تاج وتخت کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ "سنبل وسلاسل" میں ان کی نظم "عارضی حکومت کے حلفِ وفاداری پر دو نعرے" میں نہ صرف حیرت بلکہ غم وغصہ کا وہی جذباتی طوفان بہہ رہا ہے جو جوش کی خصوصیت ہے۔

پھر ہندوستان ہو کر آزاد ہوا، خون کا جو خراج برطانیہ کی طاقت سے جنگ کر کے دیا جاتا وہ آخر کار اپنوں ہی دینا پڑا۔ لیکن خون کا اس طرح بہنا عزت اور بہادری کی نہیں، بزدلی، وحشت اور انسانی انسان کی نشانی تھا۔ چنانچہ جوشؔ نے جی کھول کے مذہب کے نام پر دکھائی ہوئی دلیری اور جواں مردی کو اپنے تیروں کا نشانہ بنایا ہے۔ آزادی کو انھوں نے دیوی بنا کر پوجا تھا، جب وہ آئی تو جوشؔ نے خوشی میں اپنائے وطن کا ساتھ دیا لیکن یہاں آزادی کی خوشی میں یہ نعرہ لگایا ؎

وطن کے روئے پاک پر ہے آبِ رنگِ سروری
قلندروں کے جام میں ہے بادۂ تونگری
شکوہ بحرِ ہند کا، ہمالیہ کی برتری
وطن کے طول و عرض کی ہمسری و داوری
ہجوم در ہجوم ہے، قطار در قطار ہے
اٹھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

وہیں آزادی کے پردے میں چھپی ہوئی قصریت کو بھی دیکھا ؎

"قتالِ خون و جنگ ہے، جنونِ جبر و قہر ہے
گرج ہے بات بات میں، فسادِ شہر شہر ہے
فضا پہ رقصِ مرگ ہے زمیں پہ موجِ زہر ہے
سپاہیوں کا زور ہے تباہیوں کی لہر ہے
کماں میں تیرِ حرب ہے، کمیں میں شہریار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے
برستیں یہ رشوتیں یہ پگڑیاں یہ چوریاں
یہ شرمناک چوریاں اور اس پہ سینہ زوریاں

سبک گراں فروشیاں ذلیل نفع خوریاں
اِدھر خلا ہے بھوک کا، اُدھر بھری ہیں بوریاں
نہ پیٹ میں نوالہ ہے نہ تن پہ ایک تار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے

حقیقت کی اس تصویر نے انھیں بیدل نہیں کیا بلکہ آزادی اور بدحالی کے تضاد میں انھوں نے وہ راستہ دیکھا جو محض ایک رومانیت پسند نہیں باعمل حقیقت پرست بھی دیکھتا ہے۔ سیاسی آزادی مل گئی ہے اب اسے حقیقی معاشی اور عوامی آزادی بنانا خود ہندوستان میں بسنے والوں کے ہاتھ میں ہے:

اٹھو دریچہ کھل گیا، وہ منزلِ فراز کا
وہ غزنوی کے قصر میں دیا جلا ایاز کا
سرا ملا وہ عقدہ ہائے گیسوئے دراز کا
چمن پہ رنگ چھا گیا وہ چشمِ نیم باز کا
رقیبِ غم نصیب ہے حبیبِ غم گسار ہے
بہار پھر بہار ہے بہار پھر بہار ہے
اٹھو کہ اس زمین کو ہم آسماں بنائیں گے
عمارتوں کو پھونک کر، امارتوں کو ڈھائیں گے
نشیب کو ابھار کر، فراز کو جھکائیں گے
سفینہ بحرِ نور میں غرور سے چلائیں گے
اگرچہ اپنے گرد و پیش آج موجِ نار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے

ترانۂ آزادیٔ وطن (سرودِ فروش ص ۲۳۱)

جوشؔ کو یہ آزادی مکمل نہیں معلوم ہوئی کیونکہ ابھی اس خاکے میں بہت کچھ رنگ بھرنا تھا۔ ایک اشتراکی سماج کی آرزو ان کے دل میں کروٹیں لے رہی تھی، وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ارتقار کی رفتار تیز ہو کر ہندوستان کو ایک ترقی پسند جمہوریت میں تبدیل نہ کر دے بلکہ اس انسانی قوم کی تعمیر کرے جس کا کوئی دین اور مذہب نہ ہو سب انسان ہوں۔

آزادی کے بعد ناقص آزادی کا احساس! یہ احساس یا تو مادی حیثیت سے پریشان حال عوام کر سکتے ہیں یا اپنے خوابوں کو چکنا چور ہوتے ہوئے دیکھنے والے ادیب اور شاعر۔ چنانچہ جوشؔ نے اپنی اس دور کی نظموں میں اس کی طرف برابر اشارے کئے ہیں۔ ہندو مسلم فسادات پر جوشؔ نے ہمیشہ زہر آگیں زلزلہ افگن اور طنز آمیز نظمیں لکھی ہیں اور تقسیم ہند کے بعد کے خونیں فسادات پر تو ان کا خون کھول اٹھا ہے۔

مہاتما گاندھی کا قتل، آزادی کے بعد کا سب سے اہم واقعہ ہے جس نے نہ صرف ہندوستانی قوم کا سر نیچا کر دیا بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ قومی زندگی کس منزل میں ہے جوشؔ نے انھیں "ہند کے شاہِ شہیداں" کہہ کر مخاطب کیا اور ایک اچھی خاصی طویل نظم میں انھیں وہ خراجِ عقیدت پیش کیا جو ان کے قومی جذبات سے ہم آہنگ تھا۔ ان کے مشاہدے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ زندگی کا کوئی اہم پہلو جس سے عام انسانی جذبات میں ہیجان پیدا ہو، ان کی کمندِ نظر سے بچ کر نہیں جا سکا۔ چنانچہ گرانی کی ہولناکی، رشوت کی گرم بازاری، نشہ بندی کی سرکاری مہم، رجعت پرستوں کی اردو دشمنی، آزادیٔ خیال پر پابندی، کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس نے جوشؔ کے احساس شاعرانہ کو بیدار نہ کیا ہو اور جس کے اظہار میں انھوں نے بے باکی اور آزاد خیالی سے کام نہ لیا ہو۔

اسی زمانے میں جوشؔ ہندوستان کی مرکزی حکومت کی طرف سے نکلنے

اردو رسالہ آجکل (دہلی) کے مدیر اعلیٰ مقرر ہو گئے اور ایک حیثیت سے سرکاری ملازمت کی زنجیر پاؤں میں پڑ گئی۔ اس نے ان کے افکار و خیالات کو کسی حد تک مصالح کا پابند ضرور بنا دیا لیکن اس کے باوجود اسی عہد میں انھوں نے کچھ ایسی نظمیں بھی لکھیں جن میں ان کی پختہ کاری اور شاعری کے آب و رنگ اور ان کی شخصیت کے خط و خال کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ کچھ نظمیں ایسی ہیں جن میں بار بار کی کہی ہوئی تغلی آمیز باتیں دہرائی گئی ہیں لیکن چند ایسی بھی ہیں جن میں جی کھول کر ملکی حکومت کی استعمارانہ نوعیت اور اس کی غیر جمہوری سیاست کا پردہ چاک کیا ہے ترقی پسند قوتوں کو مجتمع ہو کر ایک ایسا زبردست اور آخری طوفان اٹھانے کی دعوت دی ہے جو ہمیشہ کے لیے ناانصافی، جبر، استحصال اور رجعت پرستی کا خاتمہ کر دے۔ "ماتم آزادی" جو ۱۹۴۷ء میں لکھی گئی تھی لیکن جسے انھوں نے بہ تقاضائے احتیاط کئی سال تک شائع نہیں کیا، ایسے ہی خیالات کی مظہر ہے ؎

خاموش ہیں طیور، چمن سرمہ در گلو ۔۔۔ شاخیں فسردہ، خوشۂ انگور زرد رو
پھولوں کو اب نہیں ہے تمنائے رنگ و بو ۔۔۔ بلبل کو آشیاں میں قفس کی ہے آرزو

غارت گر بہار کا منہ چومنے لگے
آئیں جو آندھیاں تو چمن جھومنے لگے

سرو سہی، نہ ساز، نہ بلبل نہ سبزہ زار ۔۔۔ بلبل نہ باغباں، نہ بہاراں نہ برگ و بار
جیحوں نہ جام جم، نہ جوانی نہ جوئے یار ۔۔۔ گلشن، نہ گل بدن، نہ گلابی نہ گل عذار

اب بوئے گل نہ باد صبا مانگتے ہیں لوگ

وہ حبس ہے کہ لُو کی دعا مانگتے ہیں لوگ۔

فٹ پاتھ، کارخانے، ملیں، کھیت، بھٹیاں گرتے ہوئے درخت، سلگتے ہوئے مکاں
بجھتے ہوئے یقین، سلگتے ہوئے مکاں ان سب سے اٹھ رہا ہے بغاوت کا پھر دھواں

شعلوں کے پیکروں سے لپٹنے کی دیر ہے
آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے کی دیر ہے

وہ تازہ انقلاب ہوا آگ پر سوار وہ سنسنائی آگ، وہ اڑنے لگے شرار
وہ گم ہوئے پہاڑ، وہ غلطاں ہوا غبار اے بے خبر! وہ آگ لگی آگ ہوشیار

بڑھتا ہوا، فضا پہ قدم مارتا ہوا
بھونچال آ رہا ہے وہ پھنکارتا ہوا

اس زمانے کی بعض نظموں میں ان کے تصورِ آزادی کے ساز پورے شور کے ساتھ بج اٹھے ہیں اور رومانی ناآسودگی جو ان کے خیالات کی خصوصیت رہی ہے برابر اپنی جھلک دکھاتی رہی ہے۔ دبے پاؤں بڑھاپے کے آگے بڑھتے آنے کا احساس، ناقدری پر جھنجھلاہٹ، اپنے شاعرانہ اور فکری عقائد کا اظہار، آزادی کی خامیوں پر طنز، یہی موضوعات مختلف نظموں میں جگہ پاتے رہے ہیں۔ "ترانۂ آزادیٔ وطن"۔ "استقلال میکدہ"۔ "پند نامہ" "درسِ آدمیت"۔ "مناجات"۔ "رشوت"۔ "ہمارے فرائض"۔ "اعترافِ عجز"۔ "تین فریادیں"۔ "بے چارگی"۔ وہ نظمیں ہیں جو اس عہد کے جوش کی نمائندگی کرتی ہیں لیکن ان میں کسی خاص قسم کے ذہنی ارتقا کا اندازہ

نہیں ہوتا، ہاں کہیں کہیں پختگی خیال کی سنجیدگی ضرور نظر آتی ہے ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء میں ان کے دو مجموعے "سرود و خروش" اور "سموم و صبا" دہلی سے شائع ہوئے، ان سے جوش کی ادبی اور شاعرانہ عظمت میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوا۔ شاید اس لیے کہ ان کے خیالوں کی یکسانیت اپنی دل کشی بہت حد تک کھو چکی تھی۔

ہندوستان کی سیاست میں پاکستان کا تذکرہ کئی سال سے آرہا تھا، جوش نے مسلم لیگ کی ہمیشہ نکتہ چینی کی تھی اس لیے ان کے یہاں کبھی دو قوموں والے نظریہ کا ذکر نہیں آیا۔ صرف ایک نظم "وقت کی آواز" میں انھوں نے ایک خاص انداز سے تقسیم ہند کی حمایت کی تھی لیکن جب ہندوستان تقسیم ہو گیا تو جوش نے اس پر واضح الفاظ میں کوئی اظہار خیال نہیں کیا۔ معلوم نہیں ان کے دل و دماغ میں کیا باتیں گزر رہی تھیں لیکن ان کی نظموں میں اچھی خاصی احتیاط کے ساتھ اس مسئلہ کو نظر انداز کیا گیا تھا حالانکہ جوش عام طور سے ہر اہم مسئلہ کے متعلق اپنے فوری تاثرات کا اظہار نظموں کی شکل میں کرتے ہیں اور اس کا انتظار نہیں کرتے کہ واقعہ کی نوعیت اچھی طرح واضح ہو لے۔ بہرحال تقریباً ۱۹۵۲ء تک وہ بالکل خاموش رہے۔ پھر مشاعروں کے سلسلہ میں وہ پاکستان جانے لگے اور کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ وہاں زیادہ وقت گزارنا چاہتے ہیں۔

چونکہ اردو کے شاعر اور قوم پرست شاعر کی حیثیت سے ان کی سب سے زیادہ شہرت اور عزت تھی اس لیے اسی درمیان میں حکومت نے انھیں وہ اعزاز بھی بخشا جو ہندوستان کے صرف چند سپوتوں کو نصیب ہوا تھا یعنی انھیں "پدم بھوشن" کے خطاب یا اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ ہندوستان کی سب سے اہم علمی انجمن "ساہتیہ اکیڈمی"

کے رکن مقرر کیے گئے اور بہ ظاہر وہ ان باتوں سے خوش تھے لیکن خوش باشی، نعیش، خواہش زر اور امید قدردانی کے جذبات انھیں کہیں اور کھینچ رہے تھے چنانچہ انھوں نے آخر کار یہی طے کیا کہ وہ پاکستان میں جینا اور مرنا پسند کریں گے۔ جوش نے ہندوستان کو کیوں اور کس طرح چھوڑا، اس کی تاویل انہوں نے اپنے ایک مضمون "ھجرت" (نئی قدریں۔ حیدرآباد سندھ سنہ ۱۹۵۰ء) میں کی ہے لیکن اس کی اصل حیثیت سے ان کا سوانح نگار بحث کرے گا۔ یہاں صرف اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے۔

پاکستان کے دوران قیام میں جوش نے کچھ مختصر نظمیں، کچھ رباعیاں اور چند طویل مذہبی نظمیں لکھی ہیں، جن میں سے ایک طلوع فکر نام سے سنہ ۱۹۵۷ء میں شائع ہو گئی ہے۔ کچھ مضامین بھی شائع کیے ہیں لیکن ابھی یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان کی یہ "ہجرت" ان کی شاعرانہ اور ادبی زندگی کے لیے کس حد تک سازگار ثابت ہوگی اور انھوں نے جو وقار بہ حیثیت ایک انسان کے کھویا ہے وہ بہ حیثیت شاعر کے حاصل کر سکیں گے یا نہیں۔

ذہنی ارتقا کی اس نقشہ کشی میں جوش کی شخصیت کے خط و خال کسی نہ کسی حد تک ابھرے ہیں لیکن چند سطروں میں انھیں اور نمایاں کر دینا اس باب کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔[1]

جوش کی شخصیت ان کے شاعرانہ انداز نظر کی طرح پیچ و خم رکھتی ہے وہ جب اُن کے اشعار کے نقاب میں چھپ جاتی ہے تو گفتگو میں ظاہر ہوتی ہے اور گفتگو میں واضح نہیں ہوتی تو اشعار میں نمایاں ہوتی

---

[1] یہاں میں اپنے ہی ایک مضمون کے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

ہوتی ہے اس شخصیت کی تشکیل میں خود ان کی عمر کے تقریباً ساٹھ سال اور ان کی کئی پشتیں شریک ہیں، اسے وقت کے تقاضوں نے سنوارا ہے اور مختلف قسم کے اثرات و تصورات نے رنگ و روغن چڑھائے ہیں۔ جنون و حکمت کی آمیزش، شعلہ و شبنم سے ساز، فکر و نشاط سے وابستگی، عرش و فرش کی سیر، سیف و سبو سے شغل، سموم و صبا سے دلچسپی اور حرف آخر کہنے کی آرزو نے جوش کی شخصیت کو پیچیدہ تر بنا دیا ہے۔ یہ ایک بے قید و بند ہواؤں کی طرح بکھرنے والے شاعر اور وقت کی آواز پر کان دھر کر فکر کے سانچے میں ڈھلنے کے آرزومند تفکر پسند انسان کی شخصیت ہے جو بے راہ روی اور اخلاقی اقدار دونوں کو دعوت دیتا ہے کہ اسے سہارا دیں۔ جوش کی زندگی اور اطوار میں کلاسیکیت اور رومانیت، معین راستوں اور نئی جستجوؤں، قدامت اور جدت کی ایسی آمیزش ہے وہ بعض اوقات مجموعۂ اضداد نظر آنے لگتے ہیں اور اسی تضاد کی پرچھائیاں ان کی شاعری اور افکار پر پڑنے لگتی ہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ وہ شخصیت بزم سخن میں کچھ اور ہوتی ہے اور بساطِ عمل پر کچھ اور۔ وہ ایک پروگرام بناتی ہے اور فلسفہ میں کھو جانے، رندی و سرمستی میں وقت گزارنے، لبِ جاب سے قصہ خونیں سننے اور تماشائے لب بام دیکھنے کے اوقات مقرر کرنا چاہتی ہے ایسی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے چلنے، اس کی صبح و شام میں شریک ہونے، خلوت و جلوت میں اس کے ساتھ وقت گزارنے، اس کے ہمراہ خوشی اور غم کے لمحات بسر کرنے، اسے سوتے جاگتے، مشاہدہ کرتے، اس کو دوستوں میں خوش طبعی کرتے اور سنجیدہ صحبتوں میں بحثیں چھیڑتے دیکھنے اور نیازمندی اور تمنائے نازبرداری کی منزلوں سے گزرتے اس پر نظر کرنے کی ضرورت ہے۔ شاید کوئی شخص ان کے اس پروگرام

کی طرف متوجہ کرے کہ انھوں نے اپنا پتہ آپ بتا دیا ہے لیکن پروگرام محض ان کے جسم کی تلاش میں مدد دیتا ہے، ان کی روح اور شخصیت اس میں نہیں ملتیں۔ یہ وہ جوش نہیں جو "میں" کہہ کر "کائنات" گرا لیتا ہے اور اسے اپنی انفرادی ذات کے گرد محیط کر لینا چاہتا ہے۔ انھیں اپنے تضاد کا خود احساس ہے ؎

جھکتا ہوں کبھی ریگ رواں کی جانب
اُڑتا ہوں کبھی کاہکشاں کی جانب
مجھ میں دو دل ہیں، ایک مائل بہ زمیں
اور ایک کا رُخ ہے آسماں کی جانب

لیکن اس تضاد میں وہ صورت نہیں ہے جسے نفسیات کی زبان میں پارہ پارہ ہونا کہیں گے بلکہ یہاں شاعر کو اپنی ہمہ جہتی اور آزاد نگاہی پر فخر ہے جس کا ذکر وہ بار بار کرتے رہے ہیں مثلاً ؎

اے محرمانِ کہنہ دائے دوستانِ نَو — اک وضع پر نہیں ہے مرے ولولوں کی رَو
کعبہ کا نور ہوں تو کبھی بتکدے کی ضَو — گرتی ہے گاہ برف نکلتی ہے گاہ لَو

دریا ہوں اک مقام پہ رہتا نہیں کبھی
اک خطِ مستقیم پہ بہتا نہیں کبھی

وہ زمزمہ ہوں جس کی نہیں کوئی خاص لے — وہ نالہ ہوں کہ ہو نہیں سکتا جو وقفِ نَے
مجھ میں نہیں ہے دہر کی ہر گرم و سرد شے — زہرہ و زلال و زمزم و زہراب و قند و مے

شاعر کا دل فقیر ہے اور نگیر کا
سنگم ہوں رد و نائے جدید و حریر کا

(جلال و جمال ، سرود و خروش ص ۲۸)

جوشؔ آفریدی پٹھانوں کے ایک بہت ہی خوشحال گھرانے میں اس وقت پیدا ہوئے جب انیسویں صدی کا آفتاب غروب ہو رہا تھا اور خود امارت و ثروت کے تصورات بدل رہے تھے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ یہ افغانی خاندان سرزمینِ اودھ کی ہواؤں میں پلا تھا، رنگینوں اور لطافتوں کی سرزمین! جوشؔ اسے کبھی نہیں بھولتے کہ وہ افغانی ہیں، رئیس ابنِ رئیس اور صاحبِ سیف و قلم اجداد کے وارث ہیں، اب بھی جب کبھی جوشؔ کو چھیڑ دیا جائے اور ان کے بزرگوں کا ذکر شروع کر دیا جائے تو وہ مزے لے لے کر ان کے کردار کے انوکھے پن کی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے دادا محمد احمد خاں کا ذکر کرتے ہوں یا اپنے نانا رستم علی خاں (بھرت پور) کا، اپنے والد بشیر احمد خاں کا یا اپنے چچا اسحٰق خاں کا، ہر ایک کی زندگی ایک دلچسپ داستان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بعض حیثیتوں سے یہ انوکھا پن ان کے کردار میں بھی ہے جسے حالات کے بدل جانے کے بعد بھی وہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

جوشؔ کا کردار ایک ذہین، ذکی اور سریع الحس انسان کا کردار ہے جو عمل میں کم اور خیال میں زیادہ اپنے ماحول اور گردوپیش کے واقعات سے متاثر ہوتا ہے لیکن عموماً بالکل وقتی اور عارضی طور پر۔ جس وقت جو جذبہ ان پر طاری ہوتا ہے اس وقت وہی ان کے لیے ساری صداقتیں رکھتا ہے اور وہ اُسی کی گرفت میں ہوتے ہیں۔ جب اس جذبہ کی شدت کی بنا پر کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں تو ان کی ذہانت اور طباعی اس کے لیے استدلال بھی تلاش کر لیتی ہے، رفتہ رفتہ وہ جذباتی نتائج کو منطقی نتائج سمجھنے لگتے ہیں۔ شدتِ جذبات اور سریع الحسی نے جوشؔ میں بہت سے متضاد عناصر پیدا کر دیے ہیں اور چونکہ وہ سب باتیں ان کی شاعری اور گفتگو میں نمایاں جگہ پا چکی ہیں اس لیے

جوشؔ ان سے دست بردار بھی نہیں ہوتے۔ گو تفکر انھیں بچپن سے عزیز ہے اور انھوں نے اسے سینے سے لگائے رکھا ہے لیکن ان کا ذہن طبعاً جذباتی ہے منطقی نہیں، بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہو کہ ان کی منطق بھی جذبات ہی کی گود میں پرورش پاتی ہے، مذہب، خدا حیات بعد موت، جبر و اختیار، مقصد حیات، علم انسانی، عقل و عشق کے مقامات، ان تمام مسائل پر انھوں نے غور کیا ہے اور حسین رنگین شاعرانہ انداز میں ان کے بعض مقامات کو پیش بھی کیا ہے لیکن ہر مقام پر عقل و جذبہ کی آمیزش اتنی شدید رہی ہے کہ مفکر جوش کو شاعر جوشؔ نے اکثر شکست دے دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف مطلق جبر کے قائل ہیں اور دوسری طرف انسان کو عمل پر اکسا کر خدا بننے اور کائنات کو تشکیل کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں باتیں جبر کے تحت ہو رہی ہیں۔ جوشؔ میں عجیب طرح سے ایک بت پرست اور بت شکن کی روحیں مل گئی ہیں۔ خود کہتے ہیں ؎

عفریت، خبیث، دیو، اژدر، شیطاں
درویش، اقطاب، امام، مرسل، یزداں
گیتی، گردوں، بہشت، دوزخ، اعراف
یہ سب ہیں مرے دل میں خروشاں دتیاں

جوشؔ کا سینہ کتنے متضاد اور متصادم عناصر کی جولانگاہ ہے، کیا ان کی شخصیت اور کردار میں ان کا اظہار نہیں ہوگا۔ پھر کیا جوشؔ کی شخصیت ایک پارہ پارہ بیمار شخصیت ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے، ان کا ذہن جن تاثرات کو بجلی کی طرح قبول کر لیتا ہے ان کا اظہار ان کے تخیلی کارناموں میں فوراً ہو جاتا ہے چاہے عمل میں نہ ہو سکے۔

یہ چیز ان کے افتادِ مزاج سے ہم آہنگ ہے کیونکہ ان میں ناز برداری کے متمنی ایک عیش پسند کی روح ہے جس کا بچپن پھولوں کی سیج پر گزرا، جو محبت میں کامیاب رہا، جس نے اپنی راتیں زلفوں کے سایہ میں گزاریں۔ جو اپنے حسبِ توقع نہ سہی پھر بھی ملک کی متاعِ عزیز بننے میں کامیاب ہوا۔ ان حالات میں اگر جوش کی شاعری اور کردار کے سمجھنے میں الجھن پیدا ہوئی تو تعجب کی بات نہیں ہے۔ ۱۹۳۷ء کے قریب جوش نے اپنے ارتقائے ذہن کی منزلیں یوں پیش کی تھیں ؎

اک زمانہ وہ بھی تھا اے دوستانِ باصفا
ابر سا رہتا تھا میری روح پر چھایا ہوا
طیش، رسمِ دشمنی پر طیش آتا تھا مجھے
غصہ انگاروں پہ راتوں میں لٹاتا تھا مجھے
موڑتی تھی دشمنی جب دوستی کی سمت باگ
میری افغانی رگ و پے میں بھڑک اٹھتی تھی آگ
دیکھتا تھا آدمی کو جب ذمارت کا شکار
اینٹھنے لگتی تھیں گردن کی رگیں بے اختیار
دل یہ کہتا تھا کہ ہر سینے میں خنجر بھونک دوں
خلق کو بھڑکے ہوئے دوزخ کے اندر جھونک دوں

لیکن اس مدت میں جب بالغ ہوئی میری حیات
آنکھ جھپکانے لگے دل میں رموزِ کائنات
دیکھتا کیا ہوں کہ ماحول و وراثت کا جُوا
نوعِ انساں کے سب کے شانے پہ ہے رکھا ہوا

فطرت و طینت، سرشت و ربت، طبع و ضمیر
ایک انساں اور اتنے قید خانوں کا اسیر
کیا جہالت تھی کہ کھاتا تھا بشر پر پیچ و تاب
حد ہے اس معصوم کو دیتا تھا مجرم کا خطاب
جس کے افسانے کا ہے عنوان آدم کا ہبوط
جس کی پیشانی پہ ہیں جبرِ مشیت کے خطوط
بھول انگاروں پہ راتوں کو لٹاتا تھا مجھے
حیف اس مظلومیت پر تاؤ آتا تھا مجھے

اب مرا غیظ و غضب اپنے سے شرمانے لگا
مجھ کو انساں کے گناہوں پر ترس آنے لگا
بھید پاتا تھا کہ دل سے غیظ کم ہونے لگا
آدمی کی بے نوائی دیکھ کر رونے لگا
اور جب اس سے بھی کچھ گہری نظر جانے لگی
مجھ کو انساں کی خطاؤں پہ ہنسی آنے لگی
بیقراری کے عوض دل کو قرار آنے لگا
نوعِ انسانی کی گمراہی پہ پیار آنے لگا
اک نیا احساس اس سینے میں اب پاتا ہوں میں
دشمنی کرتے ہیں دشمن اور گھبراتا ہوں میں
بےکس و مجبور انساں کو دعا دیتا ہوں میں
وار کرتا ہے کوئی تو مسکرا دیتا ہوں میں
(بلوغِ حیات ذکر و نشاط ص ۱۱۰)

مفروضہ جبر کے عقیدے کے ماتحت خیالوں میں یہ تغیرات، فکر کے مقابلہ میں تخیل کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں لیکن یہی عقیدہ تضاد کے لئے ان کی پرکار کا کام دیتی ہے مختصر یہ کہ جوش کی شاعری اُن کے ذہنی ارتقاء کا آئینہ ہے۔ اُن کی شاعری اُن کی شخصیت کے جلال و جمال، حسن و قبیح اور بلندی و پستی کو بڑی خوبی سے منعکس کرتی ہے۔ اُن کی ذہنی کشمکش، فکری واماندگی، تصور پرستی، سماجی عقائد ہر ایک کی جھلک اُن کی ہزارہا نظموں میں بکھری پڑی ہے۔

ان کی شخصیت میں جو مزاجی بانکپن ہے وہ روایت اور بغاوت کی کشمکش، سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن وہ روحانیت اور تصوّف سے مادّیت اور حقیقت کی طرف، تقدیر پرستی سے جبر کی طرف اور جنون سے حکمت کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور یہ سفر ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ جوش کو یہ کہکر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی شاعری کھوکھلی اور سطحی ہے، یا رومانی عنصر کی زیادتی نے فکری عنصر کو ان کی شاعری میں بالکل ختم کر دیا ہے۔ ان کی تنقید ہو سکتی ہے، انھیں چھوڑا نہیں جا سکتا۔ آئندہ ابواب میں ان کے فکری اور فنّی تصوّرات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔

۲- نظریۂ شاعری

اگر جوش کے نظریۂ شاعری پر شروع ہی میں غور کیا جائے تو آگے بڑھ کر ان کے افکار و خیالات اور شعور و فن کے متعلق رائے قائم کرنے میں آسانی ہو گی کیونکہ اسی میں ان کے اُس جمالیاتی اور تصوراتی اندازِ نظر کا سراغ ملے گا جس نے تخلیقی عمل کی منزلوں میں ان کے لیے رہنما اور سہارے کا کام دیا ہے۔ یہ نظریہ بھی عام تصورِ حیات اور احساسِ فن کا ایک جز ہوتا ہے جو ارتقائے ذہن کے ساتھ وجود میں آتا ہے اور ان تاریخی اور مادّی حالات کا تابع ہوتا ہے جن سے ذہن کو سماجی دائرے کے مختلف حصّوں سے گزرتے ہوئے واسطہ پڑا ہے۔[1]

ہر شاعر نے یہ بات ضروری نہیں سمجھی کہ نفسِ شعر یا فنِ شعر گوئی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق نظم و نثر میں اپنے خیالات کا اظہار کرے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ شعر کے حسن و قبح، اسلوب اور انداز، مضمون اور موضوع کے متعلق اس نے جو کچھ کہا ہو وہ مکمل طور پر اس کی شاعری پر بھی صادق آتا ہو یا شعوری طور پر اس نے اس کی پیروی کی ہو تاہم جب

---

[1] اس باب میں اپنے ہی ایک مضمون 'جوش کا نظریۂ شاعری'، مطبوعہ شاہراہ دہلی جنوری فروری ۱۹۵۴ء سے مدد لی گئی ہے۔

کبھی کسی شاعر کی یہاں شاعری کے اصول اور فن کے متعلق رائیں ملتی ہیں تو یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ انھیں یکسر نظر انداز کر کے اس کی شاعری پر گفتگو کی جائے۔ ممکن ہے وہ خود اپنے اصولوں کا پابند نہ رہ سکا ہو یا قول اور عمل میں مطابقت سے قاصر رہا ہو یا اپنے خیال میں وہ نظریہ سے مطابقت پیدا کر لیتا ہو لیکن دوسرے اسے نہ سمجھ سکتے ہوں پھر بھی اس طرح کسی شاعر کے کلام کو سمجھنے کی کوشش سعیٔ رائیگاں نہیں کہی جا سکتی۔ لاشعوری اور تحت الشعوری نفسیات کے ماننے والے بعض انتہا پسند ناقدان سخن فہم اس بات پر اصرار کریں گے کہ یہ طریق کار بے سود ہے کیونکہ فن کار اور شاعر جانتا ہی نہیں کہ وہ کیا کہتا ہے اور کیوں کہتا ہے لیکن اس وقت اس پہلو سے بحث نہیں، بحث صرف اس سے ہے کہ اگر کوئی شاعر فن شعر یا موضوعِ شاعری کے بارے میں کچھ کہتا ہے تو اسے "رازِ درونِ خانہ" سمجھ کر اہمیت دینا ضروری ہے۔ جو سینے فن کی آگ میں تپتے رہے ہیں اور جو دل تخلیق کی لگن میں دھڑکتے رہے ہیں، ان کی آواز میں کچھ نہ کچھ وزن و وقار ضرور ہو گا حالانکہ یہ بھی درست نہ ہو گا کہ غور و فکر کے بغیر اس آواز کو "غلط آہنگ" نہ سمجھ کر ہمیشہ قبول کر لیا جائے۔ اقبال نے اپنے دو شعروں میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

اور

کرم شب تاب است شاعر در شبستانِ وجود
در پر و بالش فروغ گاہ ہست و گاہ نیست

کبھی کبھی غلط آہنگ ہو جانے اور کبھی کبھی پر و بال کے بے فروغ ہو جانے کی

صورت ایک پیچیدہ نفسیاتی عقدہ ہے جس کے سلجھانے کے لئے کسی شاعر کے مزاج اور شعور کی تشکیل کرنے والے تمام کونوں کا جھانکنا ضروری ہوگا۔ جس طرح خیال کے اظہار میں غلطی ہوتی ہے اسی طرح جذبات کے اظہار میں بھی ہو سکتی ہے، یہی نہیں طرزِ اظہار بھی غلط یا نامناسب ہو سکتا ہے۔ یہی چیز ہے جس کی وجہ سے شاعر اور شاعری کی تنقید ایک بامعنی بات بنتی ہے ورنہ بعض شاعروں اور اُن کے ہم نوا ناقدوں کا تو خیال ہے کہ شعر و شاعری کی تنقید تو ممکن ہی نہیں ہے۔

یہ مسئلہ شاعروں اور نقادوں دونوں کے نقطۂ نظر سے برابر زیر بحث آچکا ہے لیکن اس نے ہمیشہ اس لیے الجھن پیدا کی ہے کہ لوگوں نے دونوں کے دائرۂ شعور کو بالکل الگ الگ سمجھ لیا ہے حالانکہ فرق نقطۂ نظر اور اختلافِ شعور کا نہیں، طریقِ کار کا ہوتا ہے۔ شاعر اور ناقد برابر ایک دوسرے کی دنیا میں داخل ہوتے رہتے ہیں، دونوں فن اور ہیئت کے بعض اصولوں، تاثر اور تاثیر کے بعض پہلوؤں، جانی بوجھی دنیا کے بعض تجربوں کا ادراک اور ...... احساس رکھتے ہیں اور شاید (بہ اختلافِ عقائد) شاعری سے ایک ہی کام لینا چاہتے ہیں۔

ان تمہیدی سطور کا مقصد یہ ہے کہ شاعر، شاعر اور ناقد کے متعلق اور ناقد، ناقد اور شاعر کے متعلق اسی اشتراک کی بنیاد پر رائے دینے کا حق رکھتے ہیں۔ جیسے ناقد اور ناقد کے درمیان ادب کی پرکھ کے متعلق اختلاف ہو سکتا ہے یا شاعر اور شاعر فن کے متعلق مختلف نظریات کے حامل ہو سکتے ہیں اسی طرح شاعر اور ناقد میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ یہ اختلاف فن اور مواد دونوں کے متعلق ہو سکتا ہے اس لیئے اس "کاروبارِ ادب" میں بڑی وسعت ہے اور اس کی جانچ بھی وسیع النظری کی بنیاد پر ہو سکے گی۔ یہ وسیع النظری محض ذوق اور وجدان سے نہیں، علم و آگہی سے

پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی شاعر شاعری کے متعلق کوئی رائے دیتا ہے تو اس کی ذمہ داریاں بھی وہی ہوں گی جو ناقد کی ہوتی ہیں۔ ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر اس وقت جوشؔ کے بعض خیالات سے بحث مقصود ہے اور وہ بھی اس لیے کہ آئندہ اُن کے تصورات کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

کوئی انھیں پسند کرے یا ناپسند، جوشؔ موجودہ دور کے بہت ہی اہم شاعر ہیں۔ انھوں نے شاعری اور زندگی کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور خیالات اور جذبات کو اعلیٰ شاعرانہ اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے خیالات کی دنیا وسیع اور جذبات کی دنیا رنگین اور پُرشور ہے جنھیں انہوں نے طرح طرح کے آب و رنگ اور سایہ و نور کے سپنوں میں ڈھالا ہے اور نظم و نثر میں برابر یہ ظاہر کیا ہے کہ خیال، زبان، اسلوب اور اظہار کے باہمی تعلق کے متعلق وہ کچھ خیالات رکھتے ہیں۔ اردو کے بہت کم شاعر ایسے ہیں جنھوں نے شاعری کے متعلق مختلف پہلوؤں سے، اتنا کہا ہے جتنا جوشؔ نے۔ اگر کسی قسم کا تجزیہ یا تبصرہ کرنے کے بجائے ان کی تحریروں سے صرف ضروری اقتباسات یکجا کر دیے جائیں تو وہی بہت کچھ کہہ جائیں گے۔ کچھ مقالات پر شعر، شاعر اور شاعری کے متعلق محض اشارے ہیں، کچھ نظموں میں احساس کمتری یا برتری نے تعلّی آمیز اندازِ بیان کی صورت اختیار کر لی ہے، جس سے کوئی اہم نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ "شاعرِ ہندوستان"۔ "غلاموں سے خطاب"۔ "نقاد"۔ "بارگاہِ شعر"۔ "آوازِ شاعر"۔ "شاعر اور لیڈر"۔ "شاعر کا دل"۔ "دنیا اور شاعر"۔ "عالم اور شاعر"۔ "غزل گوئی"۔ "شعر کی آگ"۔ "شاعر کی بخشش"۔ "شاعر و خدا"۔ "شاعر کا اضطرار"۔ "جلال و جمال"۔

یہ ساری نظمیں اس مطالعہ میں کام آسکتی ہیں حالانکہ بہت احتیاط سے

جہاں پھٹک کر ان میں سے وہ حصہ نکالنا ہوگا جو مفید ثابت ہو۔ ان کے علاوہ نہ جانے کتنی رباعیوں میں، کتنی کتابوں کے تعارفوں، دیباچوں اور مقدموں میں، کتنے مضامین میں یہ خیالات بکھرے ہوئے ہیں۔ اکثر یہ خیالات ایسے شاعرانہ، جذباتی اور وجدانی رنگ میں پیش کئے گئے ہیں کہ ان کی حقیقت تک پہونچنا ذہن و نظر کا امتحان ہے۔ کہیں کہیں تجزیہ اور جزیہ انداز میں شاعر کے منصب کا بیان بے حقیقتی کا مظہر ہے۔ ان نظموں میں خیالات کا پارہ جذبات کے ہیجان کے مطابق چڑھتا اور اترتا ہے اور اکثر کسی عارضی تحریک کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً جہاں یہ خیال ملتا ہے کہ شاعری پیغمبری ہے۔ وہیں یہ خیال بھی موجود ہے کہ شاعری عرش کی بازی گری یعنی پیغمبری نہیں ہے۔ اوپر دیے ہوئے عنوانات ہی سے اندازہ ہو جائے گا کہ زیادہ تر نظمیں شاعر کے مرتبہ سے متعلق ہیں ان میں فنِ شعر گوئی یا خصوصیاتِ شاعری سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ جوش نے اس مسئلہ پر جو کچھ بھی لکھا ہے اگرچہ اس میں شعر کی ماہیت، موضوع اور مواد، فلسفۂ شاعری، اسلوب اور طرزِ اظہار کے متعلق مربوط خیالات نہیں ملتے لیکن حسبِ ذیل مسائل کسی نہ کسی شکل میں برابر دعوتِ فکر دیتے رہے ہیں۔

۱- شعر اور شاعری سے کیا مراد ہے؟ اور شاعر کی کیا خصوصیات ہیں؟

۲- شاعر کس حد تک ماحول سے متاثر ہوتا ہے؟ کس حد تک اپنے وقت سے آگے ہوتا ہے؟

۳- لفظ اور معنی، موضوع اور ہیئت میں کیا تعلق ہے؟

۴- شاعر خود کلامی کرتا ہے یا کسی گروہ اور طبقہ کو متاثر کرنے کے لیے کہتا ہے؟

۵۔ شاعر اور شاعری کی تنقید ممکن ہے یا نہیں؟

۶۔ کیا ان مباحث کے بعد کوئی نظریہ شاعری، کوئی ادبی نقطہ نظر وجود میں آسکتا ہے؟

شعر کیا ہے؟ مختلف الخیال لوگوں نے اس کی مختلف تعبیریں اور تفسیریں پیش کی ہیں۔ جوش نے اپنے ایک مضمون "غزل گوئی" میں "شاعری کیا ہے؟" کے ذیل میں شاعری اور زندگی کے تعلق سے بحث کی ہے اور ساتھ ہی اس عمل تخلیق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس سے گزر کر ایک نظم نظم بنتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی میں آئے دن انسانی قلب پر جو اثرات پڑا کرتے ہیں وہ شعوری و غیر شعوری طور پر نوع انسانی کے افعال افکار اور اقوال کو مختلف سانچوں میں ڈھالا کرتے ہیں لیکن جب شاعر کے قلب پر یہی اثرات پڑتے ہیں تو ان کی کیفیت و شدت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ توپوں اور بادلوں کے گرجنے سے غیر شاعر پر وہ اثر نہیں پڑتا جو عینک کے تال پر ایک ذرے کے گرنے سے شاعر کے دل پر ہوتا ہے۔ ہر وہ جذبہ خواہ دیکھنے میں کتنا ہی حقیر ہو جو شاعر کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور وہ ہر اثر جو شاعر کے قلب پر پڑتا ہے وہ اس کے خون میں شامل ہو کر اس کے ہر بُن مو میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کے مشتعل سینے میں اس وقت تک

برابر تڑپتا اور مچلتا رہتا ہے جب تک کہ اپنے باحسن الوجوہ اظہار کے لیے مناسب الفاظ اور موزوں بحر انتخاب نہیں کر لیتا اور مناسب الفاظ اور موزوں بحر، جیسے ہی اس کی گرفت میں آجاتی ہے وہ شعر بن کر شاعر کے قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ میرا مدعا یہ ہے کہ شاعر جو کچھ دیکھتا اور سنتا، چھوتا اور چکھتا ہے، جو کچھ اس پر گزرتی اور وہ دوسروں پر گزرتے ہوئے دیکھتا ہے، نیز جو کچھ بھی سوچتا سمجھتا اور غور کرتا ہے، یہ تمام چیزیں اسکے دل و دماغ میں کروٹیں لیتی رہتی ہیں اور جلد یا بدیر پختہ یا رسیدہ ہو کر، شعر کا لباس اختیار کر لیتی ہیں، کبھی تو یہ عمل بجلی کی سی سرعت کے ساتھ واقع ہوتا ہے اور کبھی دیر لگ جاتی ہے لیکن ...... ناممکن ہے کہ شاعر پر کوئی اثر پڑے اور وہ شعر بننے کے عوض خود اسکے دماغ میں کھپ کر رہ جائے۔

شاعری جہاں آپ بیتی ہے وہاں جگ بیتی بھی ہے، شاعری اگر داخلی ہے تو خارجی بھی ہے، اس لیے اگر ہم شاعری کو حیات کی مصوری اور زمانے کی تاریخ نویسی کا لقب دیں تو در اصل یہ حقیقت سے بعید نہ ہوگا[1]۔"

---

[1] اشارات ص ۱۷ تا ۲۲

اس کے بعد شاعر کے متعلق بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اور اگر ان سطروں کو بہ غور پڑھا جائے تو چند ایسے دل چسپ نتائج نکلیں گے جو تصور پرستی اور حقیقت پسندی کی آمیزش ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں لیکن ان خیالوں کا جائزہ لینے سے پہلے کچھ اور۔

ایک اور مضمون "ہمارے شاعر" میں یہ جملے ملتے ہیں:

"۔۔۔ شعر کی بنیاد لامحدود ہے اور عالمگیر محبت پر ہے ۔۔۔" "شعر ایک ازلی عکس ہے"

"یہ تو ایک معلوم عوام جانی مانی ہوئی بات ہے کہ شعر سراسر ایک ذوقی اور وجدانی شے ہے۔ یہ کوئی مادی چیز تو ہے نہیں کہ ہم اسے چکھ یا چھو سکیں۔ یہ کوئی نگینہ بھی نہیں ہے کہ پل بھر میں وزن معلوم کر لیا ۔۔۔"

جوش کے یہاں شاعر زیادہ تر تلمذ رحمانی سے فیض یاب ہے اس کے راستے کی شمع روح الامین کی سانس ہے جس کے قلب پر حسنِ ازل کی ضرب پڑتی رہتی ہے، جس کے دل پر الہام کی بارش ہوتی رہتی ہے اور طائرِ سدرہ جس کا ہم صفیر ہوتا ہے۔

ان اقتباسات میں شعر، تخلیقِ شعر اور شاعر کے متعلق رسمی اور فرسودہ اشاروں کے باوجود ایسی اہم باتیں کہی گئی ہیں جو ہمیشہ موضوعِ بحث رہی ہے اور جو غور و فکر کی ایک منزل پر فلسفۂ شاعری کا جزو بنتی ہیں۔ ان سطروں میں تجربہ کی مادی نوعیت، اس سے اثر پذیری اور اس کے اظہار میں شاعر کے طریقِ کار کا تذکرہ ہے۔ ایک حیثیت سے فن کے یہی مدارج ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ تجربہ حاصل کرنے کی منزل سے لے کر اس کے جذباتی اور فنی اظہار اور مقصدِ اظہار تک کی منزل میں فن اور تنقید کے سارے

اہم مدارج آجاتے ہیں لیکن شاعر کے ملہم غیب یا مافوق الفطرت مخلوق ہونے بن کر سامنے آسنے کی وجہ سے عام انسان اور شاعر کے درمیان ابہام و تفہیم کی خلیج وسیع تر ہو جاتی ہے۔ یہ عینیت کی منزل ہے اس کے برعکس جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شاعر اپنی اور دوسروں کی زندگی کو دیکھتا ہے اور اپنے حواس خمسہ کی مدد سے ان حقیقتوں کا ادراک کرتا ہے، اس سے اس کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے اور یہ ہیجان اسے شعر کہنے یا اظہار خیال پر مجبور کرتا ہے۔ شاعر کا احساسِ فن مناسب الفاظ اور موزوں بحر کا انتخاب کر کے انھیں فن پاروں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جذبات اور خیالات کی اس ترسیل میں شاعر کبھی کامیاب ہوتا ہے کبھی ناکام۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جوش ایک حقیقت پسندانہ اور عقلی نقطۂ نظر اختیار کر رہے ہیں لیکن کیا وہ اس پر قائم رہتے ہیں؟ شاعری خیال اور عقیدے کی جذباتی ترسیل ہے، وزن اور لفظ کے سانچوں میں ڈھل کر۔ یہی جذباتی صداقت شعر بنتی ہے اور یہیں شاعر کو فن کے سب سے نازک مرحلہ سے واسطہ پڑتا ہے۔

جوش نے شاعروں کو "حیات کی مصوری" اور "زمانے کی تاریخ نویسی" کہا ہے۔ گویا وہ کسی نہ کسی حیثیت سے شاعری میں مواد اور موضوع کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور شاعر کے لیے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ انھیں "موزوں ترین جامہ الفاظ پہنانے کی صلاحیت اور قدرت بھی رکھتا ہو۔" لیکن ان کی تصوریت انھیں اس خیال پر بھی مجبور کرتی ہے کہ ترسیل اور اظہار ممکن نہیں ہے۔ اظہار کے لیے زبان اور لوازمِ فن سے واقفیت ضروری ہے، جوش کہتے ہیں کہ زبان میں شدتِ جذبات کو ظاہر کرنے کی قوت ہی نہیں ہے۔ ان کی ایک اہم نظم "نقاد" غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہے ؂

دل میں جب اشعار کی ہوتی ہے بارش بے شمار
نطق پر بوندیں ٹپک پڑتی ہیں کچھ بے اختیار

ڈھال لیتی ہے جنھیں شاعر کی ترکیب ادب
ڈھل کے گو وہ گوہر غلطاں کا پاتی ہیں لقب

اور ہوتی ہیں تجلّی بخشِ تاجِ زرفشاں
پھر بھی وہ شاعر کی نظروں میں ہیں خالی سیپیاں

جن کے اسرارِ درخشاں رُوح کی محفل میں ہیں
سیپیاں ہیں نطق کی موجوں پہ موتی دل میں ہیں

شاعری کا خانماں ہے نطق کا ٹوٹا ہوا
اس کا شیشہ ہے زباں کی ٹھیس سے ٹوٹا ہوا

چھائے رہتے ہیں جو شاعر کے دلِ سرشار پر
لوٹ کر آتے ہیں وہ نغمے لبِ گفتار پر

جاگتے رہتے ہیں دل کی محفل خاموش میں
بند کر لیتے ہیں آنکھیں نطق کی آغوش میں

لوگ جن کی جانگدازی سے ہیں دل پکڑے ہوئے
کھوکھلے نغمے ہیں وہ اوزان میں جکڑے ہوئے

اس سے بڑھکر اور ہو سکتی ہے کیا حیرت کی بات
"شعر" کو سمجھا اگر شاعر کی تو نے کائنات

"شعر" کیا؟ جذبِ دروں کا اک نقشِ ناتمام
شمّہ سا اک اشارہ ایک مبہم سا کلام

کیف میں اک لغزشِ پا کلکِ گوہر بار کی
اضطراری ایک جنبش سے لبِ گفتار کی

ایک صورت خستہ و موہوم سازِ ذوق کی

مرتعش سی ایک آواز انتہائے شوق کی
بے حقیقت نے کے اندر زمزمہ داؤد کا
عارض محدود پر اک عکس لا محدود کا
جوئے قدرت کی روانی دشتِ مصنوعات میں
ٹوٹنا رنگین ستارے کا اندھیری رات میں
شعر کیا؟ کچھ سوچنا دل میں بہ لحنِ دل نشیں
شعر کیا؟ ہر چیز کہہ کر کچھ نہ کہنے کا یقیں
شعر کیا ہے؟ نیم بیداری میں بہنا موج کا
برگِ گل پر نیند میں شبنم کے گرنے کی صدا
ترزبانی اور خاموشی کی مبہم گفتگو
لفظ و معنی میں توازن کی نہفتہ آرزو
بادلوں سے ماہ نو کی اک اچٹتی سی ضیا
جھانکنا قطرے کے روزن سے عروسِ بحر کا

یہ کہہ دینا آسان ہے کہ جوش کی شاعری محض کھوکھلی نعرہ بازی ہے اور اُن کا تفکر بے بنیاد ہے لیکن جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس کی بنیاد پر ان کے خیالوں کی حقیقت پر غور کرنا محض اہم ترین مسائل سے دوچار کرتا ہے۔ مثلاً کسی خیال یا تجربہ کی بنیاد پر جذبہ کا پیدا ہونا، جذبہ کی شدت اظہار کی کوشش۔ مکمل اظہار میں زبان اور الفاظ کی ناکامی، شاعر کو ان مختلف منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جذبہ دل ہی کے اندر شعر کی صورت اختیار کر لیتا ہے، باہر آتے آتے ایک ناقص، بے رنگ اور بے کیف کی چیز ہو کر رہ جاتا ہے، جسے دنیا تو شعر کہتی ہے لیکن شاعر جانتا ہے کہ یہ شعر

نہیں ہے۔

یہ باتیں بہت سے سوالات پیدا کرتی ہیں۔ کیا کسی خاص شاعر
کی زبان یا کوئی خاص زبان اظہارِ جذبات میں ناکام رہتی ہے یا تمام شاعروں،
تمام زبانوں اور تمام جذبات کا یہی حال ہے ـــــ اگر کسی ایک شاعر یا
چند شاعروں کا یہ معاملہ ہے تو اسے قوتِ اظہار کی ناکامی کہہ سکتے ہیں اگر
عالمگیر ہے تو لفظ اور معنی، زبان اور خیال، جذبہ اور اظہار میں کوئی رشتہ
ہی قائم نہ ہوگا یا اگر ہوگا بھی تو بہت ناقص اور نامکمل۔ ایک حد تک تو سبھی یہ محسوس
کرتے ہیں کہ بعض اوقات الفاظ جذبات کا ساتھ نہیں دیتے اور الفاظ
میں جادو بھرنے کے لیے اشاروں، کنایوں، علامتوں، تشبیہوں، اور
استعاروں سے کام لینا پڑتا ہے لیکن اگر تجربہ اور اظہار میں وہ بعد ہو
جس کا احساس جوش کو ہے تو پھر سارے فنونِ لطیفہ اور خاص کر شاعری
کے متعلق نئے سرے سے غور کرنا پڑے گا کیونکہ جب الفاظ جذبات کا
ساتھ ہی نہیں دے سکیں گے تو اظہار کی ساری کوشش بیکار ہوگی کیونکہ
جب الفاظ جذبات کا ساتھ ہی نہیں دے سکیں گے تو اظہار کی ساری
کوشش بیکار ہوگی اور شاعر کبھی یہ ظاہر ہی نہ کر سکے گا کہ وہ کیا کہنا
چاہتا تھا، ہر جذبہ گونگے کا خواب ہوگا جسے دوسرے دل تک پہونچانا
ناممکن ہوگا۔ اس طرح تخلیقِ شعر کی منطق جوش کو وہاں لے گئی جہاں
مشہور اطالوی فلسفی اور مفکر کروچے دوسری راہوں سے پہونچا تھا یعنی
شعر وہ ہے جو شاعر کے دل میں ہے۔ اصل شعر اظہار کا محتاج نہیں، اس
کی تکمیل اسی وقت اندر ہی اندر ہوگئی جب وہ لوحِ دل پر نقش ہوا،
جو باہر آیا وہ کچھ بھی نہیں۔ بلکہ بقول جوش نطق شاعری کے خانماں کو
لوٹ لیتا ہے اور شاعری کی شراب جام میں آتے آتے اڑ جاتی ہے۔ موتی
دل کے اندر رہ جاتے ہیں سیپی سننے اور پڑھنے والوں کو ہاتھ لگتی ہے
مبالغہ آمیزی سے قطع نظر، جوش نے ایک لحاظ سے یہ نظریہ پیش کیا ہے

کہ لفظ اور معنی میں کوئی حقیقی تعلق قائم نہیں ہو سکتا، اس طرح شاعر اور دوسرے لوگوں میں جو رشتہ قائم ہوگا وہ برائے نام ہوگا اور شاعر کی حیات کی مقصدی اور زمانے کی تاریخ نویسی کی کوشش بے معنی اور بے حقیقت ہوگی۔

یہ نظم جوشؔ نے ۱۹۲۴ء میں لکھی تھی جب ان کی عمر تیس سال سے بھی کم تھی لیکن جہاں تک بعد کی تحریروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے بنیادی طور پر ان کے خیالات نہیں بدلے، خیالی طور پر ضرور بعض قسم کی ترمیمیں ہوتی رہیں۔ ابتدا میں انھیں یہ خیال نہیں تھا کہ ان کی شاعری آگے چل کر قومی جذبات، سیاسی اور معاشی میلانات کی ترجمان بن جائے گی اس لئے شاعری محض شاعری تھی، تفسیر حیات نہیں تھی۔ جب قومی جد و جہد اور مقتضائے وقت نے ادھر بھی متوجہ کیا تو انھوں نے ادب اور شاعری میں انقلاب کا نعرہ بلند کیا اور اپنے عہد کے ادیبوں اور شاعروں سے کہا کہ اپنے ادبیات میں حیات و بیداری کا خون دوڑائیے اور ہندوستان کو عظیم تر بنانے کے لئے دل و جان کی قربانی سے کبھی دریغ نہ کیجئے۔ انھوں نے شاعروں کو یہ بھی یاد دلایا:

"ایک صحیح جنبش قلم ستر ہزار برہنہ تلواروں
کے مقابلے میں زیادہ کارآمد آلہ جنگ
ہے"

یہ ۱۹۳۷ء کی بات ہے جب آزادی کی جد و جہد تیز تھی اور ترقی پسند ادبی تحریک شاعروں اور ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ یوں بھی اکثر مقامات پر جوشؔ نے شاعر کے ماحول سے متاثر ہونے اور اس تاثر کے ظاہر کرنے کا تذکرہ کیا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاعر کی نگاہ مستقبل میں در آتی ہے اور ان

باتوں کا ذکر کرتی ہے جس سے دوسرے واقف نہیں۔ تعلّی کے انداز میں یہ جذبہ بار بار ظاہر ہوا ہے ؎

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
صد حیف کہ قدرت سے ملا ہے یہ حکم
قدرت کو سنائے جا ترانہ اپنا

مفلس ہوں مگر وارث فطرت ہوں میں
اسرار پیمبری کی دولت ہوں میں
اے لمحۂ موجود ادب سے ہٹ کے آ
آئندہ زمانے کی امانت ہوں میں

اک عمر سے زہر پی رہا ہوں اے دوست
سینے کے شگاف سی رہا ہوں اے دوست
گویا سرِ کوہسار تنہا پودا
یوں اپنے وطن میں جی رہا ہوں اے دوست

شاعری میں موضوع اور ہیئت یعنی خیال اور بیان کے تعلق کا مسئلہ بہت ہی پیچیدہ ہے جوش کے متضاد خیالات کی وجہ سے ان کے نقطۂ نظر کے سمجھنے میں اور دشواری پیش آتی ہے۔ ایک جانب وہ "وزن شعر کی منزل" میں "جراحت دل انسان" لانے کے متمنی ہیں۔ دوسری طرف شاعری میں بیان ہی کو سب کچھ سمجھنے پر مصر ہیں۔ ایک طرف شاعر سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ شاعری کے ذریعہ

ذہنی انقلاب کا سامان بہم پہونچائیے۔ دوسری طرف اسے اظہارِ خیال کی بے روک ٹوک آزادی دینا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں شعریات اور نقد کے بعض اہم مسائل سامنے آتے ہیں۔ کیا شاعری کا کام تعلیم، تلقین، اصلاح یا تنظیم جذبات ہے یا محض لطف، مسرت اور حظ کی ایک لطیف فضا پیدا کردینا؟ کیا یہ فضا بھی تنظیم جذبات یا تطہیر ذوق میں معین نہیں ہوتی؟ کیا اظہارِ خیال میں کوئی ایسی منزل نہیں آتی جہاں شاعر "پیمبر" بننے کا آرزومند ہو؟ جوش ان میں سے ہر ایک کے متعلق کوئی نہ کوئی رائے دیتے ہیں لیکن ان کے متضاد بیانات سے اس کا اثر زائل ہوجاتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"شاعر کی طبیعت یہ ہے کہ وہ کائنات کے ہر ذرّے، حیات کے ہر تیور، حواس اور ماورائے حواس کے ہر پہلو، احساسات کے ہر رخ اور جذبات کی ہر ادا کا مطالعہ کرتا ہے، اس سے متاثر ہوتا ہے اور ان تاثرات کو موزوں ترین جامۂ الفاظ پہنانے کی صلاحیت و قدرت بھی رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ شاعر کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی ایک موضوع، کسی ایک مقصد، کسی ایک تعلیم، کسی ایک فلسفے اور حیات کے کسی ایک رخ کے اندر قید ہو کر نہیں رہ سکتا۔ وہ تو قرآن کی زبان میں ہر آن نئی نئی وادیوں کی سیر کیا کرتا ہے، وہ تو ہواؤں کی طرح آوارہ، ابر کی طرح بے پروا خرام، تصورات کی طرح بے قید و بند اور اپسرا کی طرح آزاد

ہوتا ہے۔

وہ کہیں ٹھہر بھی کیونکر سکتا ہے ...... اس
کے سپرد تو اتنے ناقابلِ شمار فرائض ہوتے ہیں کہ وہ
منزل پر ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی
حالانکہ ہر منزل اس کی ہے ...... وہ تو اپنے مشاغل کی فراوانی
کے باعث گھبرایا گھبرایا سا رہتا ہے، وہ کیا کرے اور
کیا نہ کرے۔ کسی فریضے کو انجام دے اور کسے
ملتوی کرے...... ''

شاعر کے کلام سے آپ اس کے مزاج کی افتاد، اس کے احباب اور خاندان کا معیار، اس کی زندگی کے مختلف واقعات معلوم کر سکتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس کا کلام اس کی ایک نوع کی بیاگرافی (سوانح عمری) ہوتا ہے اور صرف یہیں تک نہیں، آپ کو اس کے کلام سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کے زمانے کی سوسائٹی کا کیا رنگ تھا، اس کے دور میں عام پبلک خیالات کی کیا نوعیت تھی، اس وقت کے معاشری، مذہبی اور سیاسی انتشار (؟) کیا تھے اور اس کے ہم عصروں کی ذہنیتوں کا رخ بالعموم کس طرف تھا[۱]
اگر الفاظ کے کچھ معنی ہوتے ہیں تو ان خیالات کا بیتش کرنے کا کبھی شاعروں اور نقادوں کے ساتھ محسوب نہیں کیا جا سکتا جو شاعری کو محض شاعر کے دل کی آواز یا محض بیان سمجھتے ہیں، شاعری ان کے نقطۂ نظر سے حیات کی ترجمانی ہے محض لفظی شعبدہ بازی نہیں لیکن جب اس کے بعض دوسرے خیالات کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو عجیب و غریب نتائج برآمد ہوتے ہیں شاعر

---

[۱] اشارات ص ۲۳، ۲۴۔

کی نراجی آزادی، جبر کا عقیدہ رومانی شدتِ جذبات سب ایک دوسرے میں مل جاتے ہیں اور جوشؔ کا نظریۂ شاعری پریشان خیالی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ۱۹۵۳ء میں انھوں نے شکستِ زنداں کے عنوان سے تک نظم لکھی[۱] جس میں انھوں نے ان شعراء پر اعتراض ہی نہیں کیے بلکہ اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں اُن کا مذاق اڑایا جو محض روس اور چین کے موضوع پر نظمیں لکھتے ہیں اور جن کا کلام اغلاط زبان و بیان سے پُر ہوتا ہے۔ اختلافِ خیال یا واقعی لسانی خامیوں کی وجہ سے نئے شعراء کا کلام اعتراض کا مستحق قرار پا سکتا ہے لیکن جوشؔ نے یہیں پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس نظم میں ان شعراء کے متعلق یہ بھی کہا کہ

شاعری میں بیان ہے سب کچھ
کاش ہوتی یہ بات انھیں محسوس
خس نشیمن ہے عندلیب اگر
اس سے بہتر گل آشیانہ خروس

اقدار کا اس طرح گڈمڈ ہو جانا ذہنی اور فکری انتشار ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے اس نظم کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعری میں تو مضمون کا سوال ہی نہیں، اندازِ بیان اصل چیز ہے اور اندازِ بیان کا یہ نقص ہے کہ میں ادائے جذبات کی صلاحیت نہیں۔ اس طرح ساری دنیا فنی صلاحیت صفر بن جاتی ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جب شاعر کے ذمہ کچھ فرائض بھی ہوں گے (جن کا ذکر اوپر کیا گیا) تو اسے محض بیان کے دائرے سے باہر نکلنا ہی پڑے گا۔ الفاظ ہی سے کام لینا پڑے گا لیکن یہ وہ الفاظ نہیں ہوں گے جو مافی الضمیر کے اظہار پر قادر نہیں

---

[۱] یہ نظم مع ایک نوٹ کے نقوش لاہور ۳۵-۳۶ میں شائع ہوئی۔ ابھی تک کسی مجموعہ میں شامل نہیں کی گئی ہے۔

ہیں بلکہ وہ ہوں گے جو "ذی حیات" ہیں، جو انسانی سماج کے مختلف عناصر میں رشتہ کا کام دیتے ہیں۔ جوشؔ نے خود اپنے ایک مضمون "الفاظ اور شاعر" میں اس بحث کو دلچسپ شکل میں پیش کیا ہے:

"روشنائی کو کاغذ پر روشنائی کی لکیریں نہ سمجھو، وہ نہ تو بے جان لکیریں ہیں، نہ ہوا کی گرہیں۔ الفاظ تو ذی حیات ہیں انسانوں کی روح ذی حیات۔ الفاظ بھی آدمیوں ہی کی طرح پیدا ہوتے اور مرتے ہیں، بڑھتے اور گھٹتے ہیں گوشہ نشین رہتے اور سفر کرتے ہیں۔ یہ بھی اپنے اپنے خاص مزاج، عادات، رسوم روایات اور تاریخی واقعات رکھتے ہیں۔ ان کی دنیا میں بھی ذات پات اور مذہب و معاشرت کا رواج ہے۔ . . . .

شاعروں کو انھوں نے یہاں تک اختیارات دے رکھا ہے کہ وہ جب چاہیں ان کے لباس تبدیل کر دیں، ان کی لے اور رنگ بدل دیں، ان کا رخ موڑ دیں، ان کے معنوں میں تنگی یا وسعت پیدا کریں. . . . شاعر کے سامنے آتے ہی ہر نسل اور ہر مزاج کے الفاظ اپنی نسلوں اور مزاجوں کا جھگڑا بھول جاتے ہیں. . . . . شاعر کا مکان الفاظ کی عبادت گاہ ہے یہاں ادنیٰ و اعلیٰ اور شاہ و گدا ہر قسم کے الفاظ ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں اور صفوں

میں ایسی شائستگی ہوتی ہے جیسے راگنی کے
بولوں میں ہم آہنگی[1]۔"

شاعر کے عملِ تخلیق میں زبان و اظہار کا جو درجہ ہے اس کی اہمیت کسی طرح گھٹائی نہیں جا سکتی۔ جو شاعر بیان کے جادو کا منکر ہوگا وہ شاعر نہیں ہوگا وہ جو اس کے لیے ریاض نہیں کرے گا وہ فن کی دیوی کو رام نہیں کر سکے گا لیکن جو محض بیان کو شاعری قرار دے گا وہ انسانی شعور کے افق کو روشن اور وسیع تر نہیں بنا سکے گا اور اسے "گل آشنائے خردوشش" یا "خس نشیمن عندلیب" سے بہتر نظر آئے گا۔

اگر شاعر نے محض چند الفاظ یکجا نہیں کر دیے ہیں بلکہ کچھ کہا بھی ہے کوئی خیال بھی ظاہر کیا ہے تو فنّی اقدار کے ساتھ ساتھ فکری اقدار پر بھی نظر ضرور جائے گی، اس خیال کی صداقت اور عدم صداقت، اہمیت اور عدم اہمیت، سماجی زندگی سے اس کا تعلق اور بے تعلقی، اقدارِ حیات میں اس کا اضافی تناسب اور کہنے والے کے دوسرے خیالات سے اس کا ربط، ان تمام باتوں کی طرف ذہن جا سکتا ہے۔ اسے تنقید کہا جائے یا کوئی اور نام دیا جائے، اس طرح سوچنے والے کو نقّاد کہا جائے یا کوئی دوسری اصطلاح استعمال کی جائے لیکن شعر یا نظم کے معرضِ اظہار میں آجانے کے بعد نقد و نظر کے لیے راہیں کھل جاتی ہیں۔ لیکن جوشؔ نے شاعروں کے متعلق جو خیالات ظاہر کیے ہیں اور شاعری کا جو تجزیہ اپنی نظم نقّاد میں کیا ہے اس سے صرف ایک ہی منطقی نتیجہ نکلتا ہے، وہ یہ کہ شاعر اور اس کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ کرنے والے کے درمیان کوئی قدرِ مشترک ممکن ہی نہیں ہے۔ کوئی شاعر کے دل کی بات جان ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ باتیں الفاظ میں قید نہیں ہوتیں اور بیان کی گرفت میں نہیں آتیں۔ اس کی مزید توضیح انھوں نے اپنی نظموں کے انتخاب سیف و سبو کے

---

[1] اشارات ص ۱۴۱، ۱۴۰

دیباچہ میں کی ہے۔ وہاں یہ تو نہیں کہا ہے کہ شعر شاعر کے دل کی بات ہی نہیں پیش کرسکتا لیکن یہ تو نہیں کہا ہے کہ ناقد کسی نظم کے متعلق یہ رائے قائم نہیں کرسکتا کہ وہ کیسی ہے؟ ایک نظم کب کہی گئی کیوں کہی گئی، کہتے وقت شاعر کا کیا عالم تھا، کیا کھایا تھا، کھانا ہضم ہوا تھا یا نہیں، کوئی زور سے بول تو نہیں دیا تھا۔

جب تک یہ ساری باتیں کسی کو نہ معلوم ہوں وہ نظم کے متعلق کس طرح کوئی اہم بات کہہ سکتا ہے اور اگر بالفرض محال وہ یہ تمام باتیں معلوم بھی کرلے تو اپنے مزاج کو کیا کرے گا۔ وہ یا تو شاعر کا دوست ہوگا یا دشمن، دوست ہوگا تو محبت تنقید کی راہ میں حائل ہوگی، دشمن ہوگا تو نفرت رائے قائم نہ کرنے دے گی۔ گویا نہ تو "من تو شدم تو من شدی" کی شرط پوری ہوگی نہ تنقید ممکن ہوگی۔ یہ ہے جوشؔ کا استدلال۔ بہر حال ان کے نقطۂ نظر سے تنقید ممکن ہو یا نہ ہو۔ تنقید کا عمل کسی نہ کسی شکل میں جاری رہتا ہے پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار (محض سمجھ لینا اور لطف اندوز ہونا نہیں) شعوری زندگی کا ناگزیر جز بن گیا ہے اور اس اظہار کو تمدنی زندگی کے امتیازات میں گنا جاسکتا ہے۔

ابھی جوشؔ کے نقطۂ نظر کی تشریح اور تصورات کے تجزیہ کی بہت گنجائش ہے لیکن ان صفحات میں بھی شاعری کے متعلق ان کے خیالات کی بنیادوں کی کافی وضاحت ہوگئی ہے جس سے اہم نتائج نکالے جاسکتے ہیں۔ متضاد اور مبالغہ آمیز بیانات کے باوجود اتنا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جوشؔ کا رجحان ایک تصور پرست عینیت پسند روحانی کا رجحان ہے جو جمالیات کو فلسفہ کی حیثیت سے نہیں وجدان کی حیثیت سے ذوق کا رہنما بنانا چاہتا ہے انھیں ہر قدم پر وقت کے تقاضوں کا احساس ہوتا ہے اور ہر موڑ پر زمانے کی آواز سنائی دیتی ہے لیکن ان کی حقیقت پسندی رومانیت اور تخیلیت اور سیلاب جذبات

کے سامنے نہیں ٹھہرتی اور وہ شاعر کے شعور سے زیادہ اس کے وجدان، اس کی پراسرار قوت اور شاعرانہ صلاحیت پر بھروسا کرنے لگتے ہیں۔ وہ شاعر سے حیات کی مصوری کے متمنی ہیں — لیکن اقدارِ حیات کے تعین پر زور نہیں دیتے۔ ہندوستان کے جہادِ آزادی اور ترقی پسند تحریکات کے اثر سے انھوں نے موضوع اور مواد کی اہمیت، خیالات کی صحت مندی اور عظمت، نقطۂ نظر کی جمہوریت اور افادیت پر بھی زور دینا شروع کیا تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا وہ اپنی نظموں کو نظرانداز کرتے گئے۔ فنی خصوصیات اور حسنِ بیان یا صحتِ زبان اور احساسِ جمال سے بے اعتنائی برتنا شاعری کے ساتھ غداری ہے لیکن صحتِ زبان اور اندازِ بیان کے نام پر موضوع کی اہمیت اور مواد کی صحت کی طرف سے بے پروائی ظاہر کرنا شاعری کو بے جان بنانا ہے۔ جوشؔ بار بار اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جب ان کے یہ خیالات ان کے دوسرے افکار و تصورات سے ملا کر دیکھے جائیں گے تو معلوم ہوگا کہ ان میں ایک خاص قسم کی ہم آہنگی ہے جو ان کی شخصیت اور شاعری کے محاسن اور معائب دونوں کو ظاہر کرتی ہے۔

---

(۳)

رُومانیت کا تجزیہ

جوشؔ کے اندازِ شاعری پر نظر ڈالتے ہوئے اکثر انھیں شاعرِ فطرت اور مصوّرِ جذبات کہا گیا ہے۔ اُن کی تخیّل پرستی اور احساس نوازی کا تذکرہ کرکے انھیں رُومانی شاعر کا لقب دیا گیا ہے۔ یہ چیز کبھی محلِّ توصیف میں پیش کی جاتی ہے اور کبھی تنقیص کے لیے۔ اس لیے اس کی حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ گو اردو میں رومانی ادب یا رُومانی تحریک کے وجود کو باقاعدہ تسلیم نہیں کیا گیا ہے، نہ اسے تاریخ اور تنقید کی کتابوں میں جگہ دی گئی ہے لیکن رومانیت کی رُوح انفرادی طور پر بعض شعرا میں اور اجتماعی طور پر تاریخ کے ایک مخصوص دور میں نظر آتی ہے۔ انفرادیت پسند ذہن سے اس کا اتنا گہرا لگاؤ ہے کہ جب کبھی کوئی انفرادیت پسند اپنے عقائد اور خیالات کا کوسِ من الملک بجاتا ہوا ادبی شاہراہ پر گزر جاتا ہے تو رومانیت کا ایک ایسا افسوں جاگ اٹھتا ہے جسے محض ادبی روایتوں کی روشنی میں سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ جوشؔ کے ذہنی ارتقا میں انفرادیت کی جو رو ہے وہ ان کے یہاں رومانیت کی تخلیق کرتی ہے۔ اس میں کئی اور عناصر مل کر اُسے خالص رومانیت نہیں رہنے دیتے یہاں اسی کا تجزیہ مقصود ہے۔

یورپ میں جہاں رومانیت کی تحریک نے جنم لیا، جہاں اس کے علمبردار اور مبلغین پیدا ہوئے، جہاں اس کے عناصرِ ترکیبی اور ماہیت کا تجزیہ کیا گیا، وہاں بھی آج تک اس کی حقیقت اور اصلیت کے متعلق بحثیں جاری ہیں

اور نقادوں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے[1] اردو شاعری میں رومانیت کی تحریک کسی تحریک کی حیثیت سے نہیں ہے نہ وہ کسی قدیم ادبی مسلک یا طرزِ خیال سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے بلکہ اگر ہم رومانی شاعری کی نفسیات ادبی خصوصیات اور طرزِ فکر کو پیشِ نظر رکھ کر اردو شاعری کا مطالعہ کریں تو بعض سیاسی اور سماجی وجوہ کی بنا پر اس کے واضح نقوش انیسویں صدی کے آخری چالیس سالوں میں یا پھر بیسویں صدی میں نظر آئیں گے۔

آزادی کی خواہش، مغربی فلسفہ اور ادب کے اثرات، سائنس اور نئے علوم سے شناسائی، فکری اور ذہنی آزادی کے جذبے نے ایک نئی دنیا کا خواب دکھایا اور جذبات نے اس میں رنگ آمیزی کی، انفرادیت پسند شاعروں نے اس دنیا کی رنگین تصویریں بنائیں اس طرح رومانیت کے عناصر اردو شاعری میں بھی نمایاں ہو گئے، چونکہ رومانیت کے لیے شاعر کی غیر معمولی تخیلی حس ایک لازمی چیز ہے اس لیے جن شعرا کے یہاں بھی شدتِ احساس کے ساتھ ایک نئی خیالی دنیا ڈھونڈھ نکالنے کی آرزو پائی جائے گی ان میں رومانیت کی بعض خصوصیتیں نظر آجائیں گی یہی سبب ہے کہ ہم بعض قدیم شعرا کے یہاں بھی رومانی اندازِ فکر دیکھ سکتے ہیں

---

[1] یورپ میں "احیائے رومانیت" کی تحریک مختلف قسم کے سیاسی اور معاشرتی اثرات کے ماتحت اٹھارویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی اس کی فلسفیانہ بنیادوں کو روسو، شلنگل، کلانٹ، اور فختے وغیرہ نے مضبوط کیا۔ ادبی مسلک کی حیثیت سے اس کی تاریخ نہایت دلچسپ ہے۔ انگریزی ادب میں اس کا عروج ورڈسورتھ، کالرج، شیلی کیٹس اور بائرن کے ہاتھوں ہوا۔ وہاں اصل بحث کلاسیکی اور رومانی ادب کے مقابلہ اور ترجیح کی ہے۔ اس جگہ نہ تو ان تفصیلات کی گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔

کو ان کے خیالات کی فلسفیانہ، سیاسی اور سماجی بنیادیں واضح نہ ہونے کی وجہ سے تنقید جدید کے اصطلاحی مفہوم میں انھیں رومانیت پسند کہنا کچھ زیادہ درست نہ ہوگا۔ اس لیے اردو شاعری میں رومانیت کو کسی باقاعدہ تحریک کی شکل میں پیش کرنا ایک طرح کی تنقیدی اُپج سمجھا جا سکتا ہے مگر جوش کی شاعری میں اس کا سراغ لگانا ان کی بہت سی خصوصیات کے سمجھنے میں معین ہوگا۔

رومانیت کیا ہے؟ رومانیت پسند شاعروں کے یہاں کون کون سی خصوصیتیں مشترک ہیں؟ مختصراً ان باتوں پر نگاہ ڈال لینا جوش کی رُومانیت کے تجزیہ میں مدد دے گا۔

انسان کی قوتِ احساس اور قوتِ متخیلہ لاتعداد مقامات پر زندگی کی بہتی ہوئی رَو کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں کیونکہ جب ترتیب اور تنظیم میں یا مقررہ راہ پر چلنے میں مادی، ذہنی اور رُوحانی آسودگی حاصل نہیں ہوتی تو عمل، احساس اور متخیلہ ہر ایک کی آزمائش ہوتی ہے اور جن لوگوں میں حالات کو بدلنے یا نئی زندگی کی تخلیق کرنے کی لگن پیدا ہوتی ہے وہ عمل یا خیال میں ایسا ضرور کر گزرتے ہیں۔ رُومانی ذہن اپنی تخیلی حس کی زبردست قوت اور جوش کے وفور سے پہچانا جاتا ہے، احساس اور خیال کے مظاہرے ہی ایسے عمل اور کردار کے مظاہرے معلوم ہوتے ہیں۔

اس بات کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ تمام رُومانی شاعر احساس و خیال کی ایک ہی سطح پر نہیں ہوتے ان کی انفرادیت پسندی اور ذہنی نشو و نما کو دیکھتے ہوئے یہ ممکن بھی نہیں ہے اسلیئے وہ رُومان پرست جنھیں عملی زندگی میں بھی کچھ کرنے کا موقع ملا ہے گفتار محض اور خیال پرستی کی دنیا سے باہر بھی نکل پڑے ہیں۔ اپنے عقیدے پر شدت کے ساتھ یقین رکھنے کی وجہ سے اس کی اشاعت میں وہ عملاً بھی سرگرم کار ہو سکتے ہیں۔ اس کی

مثال شیلی اور بائرن کی زندگی ہے اس طرح گو یہ بالکل صحیح ہے کہ ہر رومانی شاعر اپنے لیے ایک عینی دنیا بنا لیتا ہے لیکن مادہ زندگی میں جو رکاوٹیں ڈالتا ہے اس کی وجہ سے ایک خاص شکل میں حقیقت کا احساس بھی بعض رومان پسندوں کے یہاں پایا جاتا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان میں چند چیزیں مشترک ہوتی ہیں جو فنی قیود کے باوجود ان کے اندازِ بیان ہی میں نہیں ان کے خیال اور موضوع میں بھی جھلک اٹھتی ہیں۔

ہر قید و بند سے آزادی، خیال اور احساس کی آزادی محدود کو لامحدود میں تبدیل کر دینے کی تمنا۔ ان دیکھی دنیا میں جانے کی خواہش، طلسمی جزیروں کی تلاش، خیالوں کی پر اسرار اور رنگین وادیوں میں گمگشت، نئے آسمانوں کی بلندی اور نئی زمین کی پستی، نئی فضا اور نیا ماحول، نئی جنتیں اور نئے جہنم، نیا روز حساب اور نیا پروردگار — یہ رومانی پروازِ ذہن کی منزلیں ہیں۔ جب فلسفہ کا سہارا مل جاتا ہے تو ان خیالوں میں گہرائی بھی نظر آنے لگتی ہے چنانچہ خود یورپ میں جب رومانی تحریک کا زور ہوا تو فلسفہ نے اس کی مدد کی اور عینیت پسند فلسفیوں نے حقیقت کو محض خیال اور نقوشِ احساس بتایا۔ رومانی شعرا دیکھی بھالی، معمولی اور عامۃ الورود چیزوں اور خیالوں میں بھی جدت اور ندرت کی جستجو کرتے ہیں۔ معمول اور مقررہ سے ہٹنے کی خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ ان میں انھیں ہر قدم پر حیرت کا عنصر نظر آتا ہے جھیلوں اور پہاڑوں کی عظمت، بچپن کی معصومیت، جاہل دہقانی بھولاپن فطرت کے معمولی مناظر سب اُس کے ذہن کو اس طرح اکساتے ہیں کہ وہ ان میں کوئی غیر معمولی قوت کو ڈھونڈ نکالتا ہے۔

کالرج اور ورڈسورتھ جو رومانی تحریک کے فلسفی اور شاعر تھے شاعر سے اس بات کی امید رکھتے تھے کہ وہ فطری کو مافوق الفطرت

اور مافوق الفطرت کو فطری بنا دینے کی صلاحیت کا مالک ہوگا۔

تغیر اور انقلاب کے اس عہد میں یا جب انقلابی قدریں بہت واضح نہیں ہوتیں، جب مادی بنیادیں بہت مضبوط نہیں ہوتیں لیکن خیال آسودہ ہو جاتا ہے، اس وقت رومانی انقلابی تصور بھی ایک اہم سماجی فرض انجام دیتا ہے اور زندگی کی مقررہ راہوں سے ہٹنے کی تلقین کر کے نئے تجربوں کی دعوت دیتا ہے۔ انھیں تجربوں کے بطن سے نئی حقیقتوں کا انکشاف ہوتا ہے، انھیں تجربوں میں خیالوں اور حقیقتوں کے تصادم سے انسان اس نظامِ حیات کی کھوج میں نکل کھڑا ہوتا ہے جو اسے سکون بخشے اس راہ میں اگر سائنس کے اصول اور سماج کے مادی حقائق رہنما بن جاتے ہیں تو منزل مل جاتی ہے اگر محض خیال کی شمع روشنی دکھاتی ہے تو وہ صورت پیدا ہوتی ہے جسے میتھو آرنلڈ نے شیلی کا تذکرہ کرتے ہوئے پیش کیا ہے یعنی وہ ایک خوبصورت فرشتہ تھا جو اپنے چمکدار پروں کو خلا میں بے سود پھڑ پھڑا رہا تھا۔ رومانیت کا صحیح مطالعہ سماجی حقائق ہی کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے چنانچہ جب ہم جوشؔ کے رومانی تصورات کا جائزہ لیں گے تو ان کا سماجی اور تاریخی پس منظر بھی سامنے رکھیں گے کیونکہ ہم جوشؔ کے ذہنی ارتقا کا تجزیہ کرتے ہوئے دیکھ چکے ہیں کہ ان کی انفرادیت نے مختلف عناصر سے قوت حاصل کی ہے اور ہندوستان کی زندگی اُن راہوں سے گزر رہی تھی جہاں رومانیت کے لیے بھی کافی مواد مل سکتا تھا

جس طرح یورپ میں روسو کی انقلابی انسان دوستی اور فطرت پرستی، اور بعض فلسفیوں کے ماورائی تصورات نے رومانیت کو ساز و برگ عطا کیے، اسی طرح ہندوستان میں جذبۂ آزادی اور عقلیت پسندی کا نئے رومانی تخیل کاری کو پرواز بخشنے مروجہ عقائد اور مروجہ

انداز نظر میں زندگی کی روکھا پن اور آزادیِ خیال کا دم گھٹتا ہوا معلوم ہوا اس لیے ہر قید و بند کو توڑ کر فضائے بسیط میں آزادی کے ساتھ چکر لگانے، ہر کوہ و صحرا پر چھا جانے، ہر وادی و کہسار پر برسنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ قدیم ادارے مضحکہ خیز معلوم ہونے لگے۔ یہاں تک کہ ساری مقررہ راہیں چھوٹنے لگیں اور رومانی افتادِ طبع رکھنے والے اپنی دنیا آپ بنانے لگے۔ چونکہ ہندوستانی رومانیت پسندوں کے پاس کوئی مخصوص فلسفہ نہ تھا اس لیے وہ اپنی انفرادی قوتِ تخیل اور احساس کے بل بوتے پر آگے بڑھتے چلے گئے۔ کبھی ان کے قدم حقیقت کی سنگین چٹان سے ٹکرائے اور انھیں ہوش آ گیا، کبھی وہ خواب و خیال کی وادی میں بے روک ٹوک پھسلتے دور نکل گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں خلوص اور دیانت داری کے باوجود فریب و حقیقت کا انوکھا امتزاج نظر آتا ہے، رومانی کبھی لذت پرستی ہی کو زندگی سمجھتا ہے کبھی عمل کی تلقین کرتا ہے، کبھی محبوب کے ساتھ چاندنی راتوں میں زندگی گزار دینے کو اصلِ حیات بتاتا ہے، کبھی کہتا ہے کہ شاعر کا فرض راستہ دکھانا ہے کبھی کہتا ہے کہ شاعری سوداگری نہیں ہے، کبھی دنیا کے معاملات میں دخل دے کر انھیں سدھارنا چاہتا ہے کبھی دنیا سے مکمل علیحدگی کا پیام دیتا ہے۔ اس طرح رومانی شاعر مختلف روپ میں نظر آتا ہے، اور بظاہر ہر روپ میں مخلص اور سنجیدہ رہتا ہے۔ کہیں وہ راہرو ہے۔ کہیں راہبر، کہیں مصلح ہے کہیں رند، کہیں مقلد ہے کہیں امام، کہیں رجعت پسند فلسفی ہے کہیں انقلابی تصور پرست، کہیں فطرت کا حسن اس کے لیے سب کچھ ہے اور انسان اس کا محض ایک ادنیٰ پجاری اور کہیں انسان سب کچھ ہے اور فطرت اس کی کنیز لیکن ان تمام پہلوؤں میں جو بات یقینی ہے وہ اس کے احساسات کی شدت اور تخیل کی رنگینی ہے جس

سے مجبور کر ہر خیال رقص کرنے لگتا ہے اور ہر ادنیٰ سی چیز انوکھی نظر آنے لگتی ہے۔

جوش کی رومانیت اپنی بنیاد میں دوسرے رومان پرستوں سے مختلف نہیں لیکن بعض پہلوؤں پر زیادہ زور دینے، بعض حقیقتوں کا خاص طرح ادراک کرنے اور بعض نقوش کو نئی طرح ابھارنے کے لحاظ سے ضرور مختلف ہے۔ جوش کے یہاں ارتقائے خیال کی جو منزلیں آتی ہیں ان پر گہری نظر ڈالنے سے اتنا تو شروع ہی میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ محض رومانی شاعر نہیں ہیں لیکن ان کی افتادِ طبع میں احساس کی جو گرمی اور تخیل کی جو فراوانی ہے وہ خیال اور حقیقت کی کشمکش اب بھی موقع پا کر انھیں رومانیت کے اس گہوارے میں ڈال دیتی ہیں جہاں کرب اور مسرت کی سرحدیں مل جاتی ہیں۔ انھیں محسوس ہوتا ہے کہ اب رومانی اندازِ نظر سے کام نہیں نکل سکتا لیکن ان کا دل بے اختیار ادھر کھنچتا ہے ؎

خسرو کا دور ہے لیکن مرے کمبخت سینے میں
جنوں کی گا ہے گا ہے پرفشانی اب بھی ہوتی ہے

رومانیت کی ایک انوکھی خصوصیت یہ ہے کہ رنج و مسرت، نشاط و الم دونوں کی انتہا پسندانہ شکلیں رومانی شعراء کے یہاں ملتی ہیں اور جب مجموعی حیثیت سے اندازہ لگایا جائے تو گو نشاط کی دھوم دھام اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے لیکن گہرا اثر غم کا نظر آتا ہے۔ انگریزی کے تمام رومانی شاعروں کے لئے مجموعی طور پر وہی کہا جا سکتا ہے جو شیلی کے الفاظ میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

"OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE THAT TELL OF SADDEST SONGS".

اور جسے جوشؔ نے ایک شعر میں یوں منظم کیا ہے ؎

میرے رونے کا جس میں قصّہ ہے
عمر کا بہترین حصّہ ہے

نشاط اور غم کا انتہا پسندانہ بیان تخیل کی گرمی کا پتہ دیتا ہے کولرج اور "ورڈسورتھ" دونوں نے تخیل کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور اس کی پُراسرار قوت کو لفظوں میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، جوشؔ بھی اس طلسمی طاقت کے سامنے مبہوت رہ جاتے ہیں:

رات کے ہنگام جب ہوتا ہے اک عالم خموش
بادِ خواب آور سے جل اٹھتی ہے یاں قندیلِ ہوش
کھولتی ہے اپنے شہپر جب سہیلی موت کی
دوڑ جاتا ہے مری نبضوں میں خونِ زندگی
کوئی پُر اسرار قوت، کوئی روحِ محتشم
شعر کہنے کو مرے ہاتھوں میں دیتی ہے قلم
دفعتہً چھیڑتے ہیں پھر ارض وسما کے زمزمے
اک کرن سی دائرے میں گھیر لیتی ہے مجھے
دل میں ہوتا ہے مرے نادر خیالوں کا ہجوم
مسکرا کر دیکھنے لگتے ہیں گردوں سے نجوم
پھر بایوسی فرشتوں کو صدا دیتا ہوں میں
آسماں کو اپنے قدموں میں جھکا لیتا ہوں میں
لکھ رہا ہوں کیا نہیں ہوتی مجھے مطلق خبر
انگلیوں پر اک جلالی نشان آتی ہے نظر
یوں قلم کرتا ہے جنبش ہاتھ میں بے اختیار
اک طرب آمیز دہشت دل کے چھو لیتی ہے تار

یوں فضا میں نقش ابھر آتے ہیں تھرّاتے ہوئے
جس طرح ساحر کے لب افسوں کو دہراتے ہوئے

کس قدر اسرار سے معمور ہیں جلوے ترے
اے تحیر خیز عارض لیلیٰ تخیل کے

تو پری ہو یا فرشتہ روح ہو یا واہمہ
آ کسی دن میرے آگے شکلِ انسانی بن آ

تحسین کے پھول (فکر و نشاط ص ۲۳)

تخیل کا یہی وہ تصور ہے عینیت پسند جسے اہمیت دیتے ہیں اور بعض اوقات اسے حقیقت سے ارفع قرار دے کر سب سے بڑی تخلیقی قوت ٹھہرا دیتے ہیں اسی سے ملتی جلتی وہ ذہنی کیفیت بھی ہے جس کا اظہار جذبہ کو عقل پر ترجیح دینے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور فطری خواہشات کی عظمت اور معصومیت اس کے نزدیک مسلّم ہوتی ہے۔ روسو جسے یورپ کی رومانی تحریک کا "باپ" کہا جاتا ہے۔ فطرت کی اسی معصومیت کو سراہتا تھا اور جذبات کی آزاد نشو و نما کو فطری انسان بننے کے لیے ضروری سمجھتا تھا۔ یہ تو نہیں معلوم کہ جوش نے روسو کا مطالعہ باقاعدہ کیا ہے یا نہیں لیکن ان کے خیالات میں روسو کے فلسفہ کی آواز باز گشت سنی جا سکتی ہے۔ لکھتے ہیں

"ہم فطرت سے اس قدر دور ہو چکے ہیں اور روز بروز اس سرعت کے ساتھ دور ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ یہ سوچ کر دل پر ایک دہشت سی طاری ہو جاتی ہے کہ آخر انسانیت فطرت دشمنی کی کس منزل پر جا کر دم لینے والی ہے۔ یہ سچ ہے کہ بد قسمتی سے انسان اب تمدن کے اس نقطہ پر آ چکا ہے کہ کامل طور سے فطری زندگی بسر کرنا تقریباً

محال ہو چکا ہے لیکن نوعِ انسانی کے ہمدردوں کا یہ فرض ہے کہ وہ مسلسل اس کی سعی کرتے رہیں کہ ان حالات میں جس قدر بھی ممکن ہے انسان فطری سادگی اختیار کر کے فطرت سے قریب تر رہنے کی جانب مائل ہو جائے۔ "فطرت کی طرف واپس چلو" کی آوازیں ہمیشہ لگاتے رہنا چاہیے کیونکہ تہذیب و تمدن کے رسوم و تکلفات کے آداب کو گھٹانا اور ان میں ہر امکانی سادگی و بے تکلفی پیدا کرنے کی دھن میں سرگرداں رہنا ابنِ آدم کے خدمت گذاروں کا سب سے بڑا فریضہ ہے ..... غرض کہ زندگی کا ہر کام اس قدر بناوٹی اور غیر فطری ہو گیا ہے کہ ہم یہ بھی بھول چکے ہیں کہ حقیقی زندگی بسر کیوں کر کی جا سکتی ہے۔[۱]

اور اسی میں بلکہ یہ بھی لکھا ہے:

طوفان کے عفریت کو بے بس کر دے
اس برقِ جہاں سوز کو پھر خس کر دے
ہنگامہ بپا ہے علم سے اے معبود
معصوم جہالتوں کو واپس کر دے[۲]

۱ اشارات ص ۱۲۰۱ ۲ جنون و حکمت ص ۸